Regd. L. No.7243

Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1978

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : 2 روپے

قرآن مجید اپنی تفسیر آپ کرتا ہے

- یہ الفاظ تو آپ نے اکثر سنے ہوں گے لیکن ان کی عملی تعبیر کم دیکھنے میں آئی ہوگی۔
- مفکرِ قرآن پرویز صاحب گزشتہ چالیس سال سے قرآنِ مجید کو اسی انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش میں مصروف چلے آرہے ہیں
- اس کے لئے انہوں نے پہلے قرآن مجید کا ضخیم اور منفرد لغت مرتب اور شائع کیا۔
- پھر قرآن مجید کا مفہوم مرتب کیا جو تیس پاروں (تین جلدوں) میں شائع ہو چکا ہے۔
- قریب تیس سال سے مسلسل درسِ قرآن دیتے چلے آتے ہیں جو ٹیپ ریکارڈز میں محفوظ ہے۔
- اب انہوں نے اس تمام تحقیق اور کاوش کے بعد قرآن مجید کی مسلسل تفسیر کا سلسلہ

مطالب الفرقان

کے نام سے شروع کیا ہے۔

- اس تفسیر میں زندگی کے اہم مسائل اور ہمارے زمانے کے تقاضوں کا حل قرآنِ مجید اور عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں نہایت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔

- پہلی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ضخامت قریب چار سو (1) و پانسو (2) صفحات۔ سفید کاغذ۔ آفسٹ کی چھپائی۔ دیدہ زیب سنہری جلد۔ قیمت (علاوہ محصول ڈاک) جلد اول چالیس (1) روپے جلد دوم پچاس (2) روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

سفینہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
ـتان ۲۲/ روپے
ـالک ۳ پونڈ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۲
دو روپے

جلد ۳۰ | اپریل ۱۹۷۸ء | شمارہ ۴

فہرست

۱۔ لمعات (۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی یادیں) ۲
۲۔ قائدِ اعظمؒ اور دو قومی نظریہ
(قرآن کریم کی روشنی میں)
(محترم پرویز صاحب) ۱۷
۳۔ یہ فارمولا کس کا ہے؟ ۳۷
۴۔ باب المراسلات ۴۶
(۱) حدیث کے متعلق میرا مسلک۔
(۲) کشف المحجوب۔
۵۔ کعبہ شریف کے امام کا فتویٰ
(سگریٹ نوشی کے بارے میں)
(پروفیسر رفیع اللہ شہاب) ۴۹
۶۔ نقد و نظر ۵۲
(۱) "متحدہ قومیت اور اسلام"
(۲) "ابتدائے اسلام میں مالک زمین اور مزارع"
(۳) "قائدِ اعظمؒ"
۷۔ قائدِ اعظمؒ اور اقبالؒ ۵۸

مدیر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ ہسپتال روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لمعات

(۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کی یاد میں)

۲۱ر اپریل علامہ اقبالؒ کا یوم وفات ہے۔ اس تقریب پر حسب سابق، پرویز صاحب ایک خاص خطاب ارزانی فرمائیں گے۔ لیکن وہ مئی کے پرچہ میں شائع ہو سکے گا۔ اپریل کے مہینے میں زیرِ نظر شمارہ ہی قارئین کے زیرِ نظر ہوگا، اس اعتبار سے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ سال گذشتہ کی طرح اس پرچہ کے لمعات، حضرت علامہ کے افکار و ارشادات کی نذر کئے جائیں۔ سو وہ حاضر ہیں۔ چونکہ یہ اقتباسات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لئے انہیں جتنی بار سامنے لایا جائے کم ہے۔ بالخصوص اس دور میں ان کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیت کو دعوت دیتا ہے

(۱) اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدہ کا، جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ دنیائے کا یہ خیال غلط ہے کہ سامنے اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے، دراصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقاء ہے۔ نسل اور حدودِ ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہرِ اتم سمجھ لیا جائے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ بلکہ در اصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوتی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے۔ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم۔

ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔ متعلقہ "فلسفہ سخت کوشی"

عالمگیر پیغام کے لئے بھی ایک سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفہ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے لیکن باعتبارِ اطلاق، وانطباق مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اسے موثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں۔ تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایسی ایک مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرۂ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو۔ لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔ متعلقہ فلسفہ سخت کوشی")

(۲)

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوتِ طلب و جستجو ایک چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید، ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیاوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے، اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسنِ معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گراں مایہ سے محروم ہے یہ متاع اسے ہمارے ہی فیضِ صحبت سے عطا ہو سکتی ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب ـــــ متعلقہ فلسفہ سخت کوشی")

مسلمانوں کا نصب العین

انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو، ایک لا متناہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں کا، خونریزیوں کا اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشاء الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین

کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمۃ اللعالمین کی ایک شان ہے۔ کہ اقوامِ بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفرقوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی اُمت کی تخلیق کی جائے جس کو امۃ مسلمۃ لک کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شھداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آ سکے۔

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں۔ متعلقہ قومیت)

اسلامی نظام

اسلام کے مذکورہ بالا دعویٰ پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اصل یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرلے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد و عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا، بعد میں نسلی قرار پایا۔ جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔ اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ بلکہ خالصۃً انسانی ہے، اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے، صرف ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومیؒ نے:

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است!

اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی اور شرفِ انسانیت کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہوگئی، اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہوگئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس نہ بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے۔ ان کے اساس کے انتخاب کا؟ لوتھر کی اصلاح، غیر سلیم عقلیت کا دور، اصولِ دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں۔ لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف!

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں۔ مضمون متعلقہ وطنیت)

مقامِ محمدی

نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے۔ جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو۔ جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ، بنی نوعِ انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان تمام آلودگیوں

سے منزہ کیا جائے، جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے، یہ ہے مقامِ محمدیؐ، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوامِ عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے، ان کو ایک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔
یقین جانیئے کہ دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے، بنی نوعِ انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں۔ مضمون متعلقہ وطنیت)

اسلام اپنے اصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا

اسلام بہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامقبول و مردود ہے۔ (بجواب مولانا حسین احمد مدنی متعلقہ قومیت)

(۲)

امتِ مسلمہ جس دین کی حامل ہے، اس کا نام دینِ قیم ہے۔ دینِ قیم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی متقوم ہے، اس گروہ کے امورِ معاشی اور مادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم، دینِ اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیرِ اسلام ہو نامقبول و مردود ہے۔ (ایضاً)

مذہب نجی معاملہ نہیں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس کی صحیح حیثیت کیا ہے. کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ نہیں؟ اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں۔ لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں، اہلِ مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشربِ رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ روحانیت پر جمالی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ

کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وارداتِ مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہے کہ ان کا تعلق محض صاحبِ واردات کے اندرونِ ذات سے ہو۔ لیکن اس کے باہر اس کے گردوپیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجہ سے ایک ایسے نظامِ سیادت کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی پر ہے، لہٰذا اس کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ (خطبۂ صدارت مسلم لیگ سنہ ۱۹۳۰ء)

(۲)

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ (ایضاً)

پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ ڈالے گی

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔ (خطبۂ صدارت۔ سنہ ۱۹۳۰ء)

کمیونزم خلافِ اسلام ہے

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں۔ اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ، افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخِ انسانی کی مادی تاریخ سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ (مکتوب بنام غلام السیدین ۔۔۔۔ محررہ ۱۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء)

یہی اسلام کی منزہ شکل ہے

لیگ کو آخر اس امر پہ طے کرنا ہو گا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی

ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی۔ عوام کے لئے کبھی جاذب نگاہ نہیں بن سکے گی (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصے میں آ جائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی (عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا)۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے پیچھے ہی ہٹتا جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو؟ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش فہمی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ (مکتوب بنام قائدِ اعظم محمد علی جناح مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

دُرِّ منثور

ان موتیوں میں سے چند ایک جو اقبال کے مکتوبات و دیگر تحریراتِ نثر میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ اسلام تقدیر کا محتاج نہیں۔ وہ بجائے خود تقدیر ہے۔ (خطبہ صدارت ۱۹۳۰ء)

زندگی اپنے ماحول میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔
(دیباچہ پیامِ مشرق)

تاریخِ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جبکہ توحیدِ انسانیت کے دقیانوسی اصول مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک توحیدِ انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ قلبِ انسانیت میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو۔ ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہیں ہوگا کہ اسلام قدرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا،

اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو قدرت کے نسل ساز قویٰ کو بیکار کر دے۔ انسانوں کے سدھارنے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔ (احمدیت سے متعلق - نہرو کے جواب میں)

اسلام کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے ناقابلِ شکست طریق سے وابستہ ہے جو اس نے تشکیل دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔ لہٰذا قومی خطوط پر کسی ہیئتِ اجتماعیہ کا قیام اسلامی اصولِ وحدت کا نقیض ہے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا۔ جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے نہ انفرادی ہے اور نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتہً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں)

اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔

(مولوی ظفر احمد صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے بصاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء، فلاسفہ پیشوایانِ سیاستین وغیرہم کو ایک نئی تحریکِ خیال سے ابھارتا ہے۔ چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ملّی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے ہیں اور انہیں خوش آیند و درخشاں بناتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو رجائیت کے نگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہلِ قوم کے عملی قویٰ کو مشلول کر دیتے ہیں اور ان کی روحانی قوتِ نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔ (بیان متعلقہ احمدیت)

جب کسی کلچر میں علاماتِ زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں، اس کے تصورات اور اس کے

واردات روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے ہی دور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بیّن ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات وکیفیات روحانی کی تشکیل نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشو ونما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق ——— اخبار لائٹ کے جواب میں)

———✲———

اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

———✲———

ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔

(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

———✲———

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (اصولِ فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا۔ اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

———✲———

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے۔ اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

———✲———

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مداہنت آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کو کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودھری نیاز علی خاں کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

———✲———

مسلمانوں پر اس وقت (ذہنی اعتبار سے) وہی زمانہ آ رہا ہے جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی

مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہ نما نہیں ہے۔ اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح کو تقریر نے میسحیت کے لئے کیا نتائج پیدا کئے ہیں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے اختیار اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ سب بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء

اس وقت (ہندوستان کے) مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے، جو اسلام کی روح اور تقدیر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں۔ اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوتِ متحرکہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے ہیں۔ دوسرا مرض احساسِ اجتماعیت کا فقدان ہے۔ اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ مذہبی تفرقہ بازی قومی وحدت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی۔ کیونکہ مذہبی فرقے اس حد تک باغی نہیں ہو جاتے کہ اسلام سے ہی منحرف ہو جائیں۔ لیکن سیاسی انتشار بالخصوص ایسے نازک وقت میں کہ ملت کا اجتماعی مفاد اتحادِ عمل کا متقاضی ہو، مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ (ریڈیائی تقریر ۱۹۳۸ء)

جو قوم دوسری اقوام سے متعلق جذباتِ نفرت رکھتی ہے ذلیل اور رذیل ہے۔

(خطبۂ صدارت۔ ۱۹۳۰ء)

میں یورپی تصور کی وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں، جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔

(خطبۂ صدارت۔ ۱۹۳۲ء)

جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی۔ وہ خونریزی، سفاکی اور زیر دست آزاری

کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انہوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں، کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔
(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔
(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو۔ امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔
(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔
(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم سے ہوئی۔
(منشی سراج کے نام خط۔ ۱۹۱۵ء)

ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ شعرائے عجم نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔
(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔

ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔ (سراج الدین پالؔ کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

تصوف کا وجود سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔
(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۷ء)

جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔
(علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ وحدانیت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔
(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔　(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا۔ تاہم میرا مسلک وہی ہے جو قرآن کا ہے۔
(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۲ء)

میرے زیرِ نظر حقائق اخلاق دملی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فنِ شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔　(پروفیسر شجاع کے نام خط۔ ۱۹۳۱ء)

شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔　(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

تبویبُ القرآن

(۱) آپ کے ذہن میں کوئی بات آئے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اِس کی بابت قرآنِ مجید نے کیا کہا ہے اور کہاں کہاں کہا ہے تو اِس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

(۲) اِس کتاب میں اِس قسم کے قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت اُن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن مجید میں کچھ کہا گیا ہے۔ اِس سے آپ اِس کتاب کی وسعت کا اندازہ لگا لیجئے۔ یہ مفکرِ قرآن کی چالیس سال کی محنتِ شاقہ کا ماحصل ہے۔

(۳) کتاب بڑے سائز کے ۱۵۱۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ عمدہ سفید کاغذ۔ آفسٹ کی چھپائی۔ تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔

قیمت مکمل سیٹ۔ ایک سو ساٹھ روپے -/۱۶۰۔ محصول ڈاک چھ روپے

چونکہ کتاب مکمل سیٹ ہی میں کارآمد ہو سکتی ہے اسلئے اس کی الگ الگ جلدیں مہیا نہیں کی جائیں گی۔

ملنے کا پتہ:

(۱) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور۔ (۲) اِدارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام کی

مطبوعات کی قیمتیں

نوٹ :- ان قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن پارہ اول	۵/- روپے
" " پارہ نمبر ۲ پارہ تا نمبر ۲۷	۳/- " (فی پارہ)
" " پارہ نمبر ۲۸ و ۲۹ (یکجا)	۷/- روپے
" " پارہ نمبر ۳۰	۵/- "
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلّد) (تین جلدوں میں)	۱۲۰/- "
مفہوم القرآن مکمل سیٹ کھلے پارے	۹۵/- "
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلد ۴ جلدوں میں)	۱۰۰/- "
مطالب القرآن (جلد اوّل)	۴۰/- "
مطالب القرآن (جلد دوم)	۵۰/- "

نام کتاب	قیمت
تبویب القرآن (مکمل سیٹ، تین جلدوں میں)	۱۶۰/- روپے
اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ ایڈیشن مجلد)	۱۵/- "
من و یزداں (مجلد)	۲۵/- "
ابلیس و آدم "	۲۵/- "
جوئے نور "	۲۵/- "
برقِ طور "	۲۵/- "
شعلۂ مستور "	۲۵/- "
جہانِ فردا "	۲۵/- "
کتاب التقدیر "	۳۰/- "
معراجِ انسانیت "	۴۵/- "
شاہکارِ رسالت "	۴۵/- "
اقبال اور قرآن "	۲۵/- "
انسان نے کیا سوچا؟ "	۲۰/- "
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں (جدید ایڈیشن)	۱۲/- "

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
ISLAM A CHALLENGE TO RELIGIO (HARD BOUND)	۴۰/- روپے	عربی خود سیکھیے (جدید ایڈیشن)	۱۰/- روپے
ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION (PAPER BACK)	〃 ۲۵/-	پاکستان کا معمارِ اوّل	〃 ۳/۵۰
سلسبیل	〃 ۱۰/-	فجر الاسلام (جلد اوّل)	〃 ۵/-
فردوسِ گم گشتہ	〃 ۱۰/-	فجر الاسلام (جلد دوم)	〃 ۵/-
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت (مجلد)	〃 ۱۵/-	منزل بہ منزل	〃 ۸/-
سلیم کے نام خطوط (مکمل سیٹ)	〃 ۳۶/-	قتلِ مرتد	〃 ۲/-
طاہرہ کے نام خطوط	〃 ۶/-	عالمگیر افسانے	۱/- روپیہ
مقامِ حدیث (جدید ایڈیشن)	〃 ۱۰/-	جمع القرآن	۳/- روپے
اسلامی معاشرت	〃 ۴/-	پرنسپل آف لا میکنگ اِن اسلام	〃 ۳/-
اسبابِ زوالِ اُمت (جدید ایڈیشن)	〃 ۴/-	تاریخ الاُمت (مکمل سیٹ) (آٹھ جلدیں)	〃 ۲۸/-
قرآنی فیصلے (مکمل سیٹ) (۳ جلدیں) (جلد دوم ـ سوم ـ جدید ایڈیشن)	〃 ۲۵/-	تصنیفاتِ ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب	
جہاد	〃 ۲/۵۰	PHENOMENON OF NATURE AND QURAN.	〃 ۵۰/-
قائداعظم اور طلوعِ اسلام	〃 ۴/-	CONSPIRACIES AGAINST QURAN	〃 ۴۰/-

ملنے کا پتہ
(۱) ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور
(۲) مکتبۂ دین و دانش - چوک اُردو بازار - لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ) بمقام — ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
149 SUTTON COURT ROAD
LONDON E13-9NR
PHONE 01-552-1517

لاہور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (فون 80800)
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

کمالیہ میں ہر جمعہ ۱/۲ ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بالمقابل چکی) اقبال آباد (فیصل آباد)

لیہ میں ہر جمعہ کے دن بعد نماز مغرب کیپٹن غلام حیدر کے مکان (نمبر ۳۵ وارڈ ۷) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ)

جام پور میں ہر جمعہ بعد نماز عشاء (بذریعہ ٹیپ) بلوچ جنرل اسٹور۔ اڈہ روڈ (ڈیرہ غازیخاں)

پشاور میں ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
بر مکان آغا محمد یونس - A - ۹ رفیق لین سٹیڈیم روڈ صدر

ملتان میں ہر جمعہ صبح ۱۰ بجے (بذریعہ ٹیپ)
(فون 72071) دفتر شاہ سنز۔ بیرون پاک گیٹ

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
(فون 28119) ۶۵ کوتوالی روڈ رحیات سرجیکل کلینک (بالائی منزل)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار چار بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی۔ بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶ لیاقت روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں) (گجرات)

پرویز صاحب کی معرکہ آرا انگریزی کتاب

ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION

جس نے اپنے ملک کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے اربابِ فکر و نظر سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔

قیمت :- (بکس بورڈ کور) ۲۵/- روپے ـــــ (خوبصورت جلد کے ساتھ) ۴۰/- روپے
(محصول ڈاک اور پیکنگ کے علاوہ) ـــــ جلد حاصل کریں - ملنے کا پتہ

(۱) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور۔ (۲) ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

باسمہ تعالیٰ

بتقریب یومِ پاکستان ۱۹۷۸ء

قائدِ اعظمؒ ...... اور ...... دو قومی نظریہ

(قرآنِ مجید کی روشنی میں)

پرویز

قیمت :- ایک روپیہ

شائع کردہ :-
ادارہ طلوعِ اسلام - گلبرگ ۲ - لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قائدِ اعظمؒ ——— اور ——— دو قومی نظریّہ

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں! کبھی سوز و سازِ رومیؒ کبھی پیچ و تابِ رازیؒ

لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ ہم (اہلِ پاکستان) کی راتیں ہی نہیں، بلکہ پوری زندگی شاید اس قسم کے سوال و جواب میں گذر جائے گی کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا۔ اس مطالبہ کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ اس کی اساس و بنیاد کیا تھی۔ اس سے مطلوب و مقصود کیا تھا؛ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس قسم کے سوالات درحقیقت موجود نہیں۔ انہیں پیدا کیا جاتا ہے۔ اور پیدا کیا جاتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی، اور انہوں نے اسے اب تک دل سے قبول نہیں کیا۔ اس قسم کے سوالات کو، وقتاً فوقتاً ابھارنے سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ (پرانی نسل جس نے تحریکِ پاکستان میں ذاتی طور پر حصہ لیا تھا، آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے)۔ آنے والی نسل کے دل میں ہندوستان سے علیحدگی اختیار کر کے، ایک الگ مملکت (پاکستان) قائم کرنے کی وجہِ جواز کے بارے میں شکوک پیدا کئے جائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی مملکت کے جواز کے بارے میں شکوک پیدا ہو جائیں تو اس کا استحکام متزلزل ہو جاتا ہے۔ یہی ان لوگوں کا منشا رہے۔ انہوں نے، نہ شروع میں بھارت سے علیحدگی کو قبول کیا تھا۔ نہ اسے اب برداشت کرتے ہیں۔ وہ علانیہ تو ایسا کر نہیں سکتے۔ اس لئے اس قسم کے لطیف حربے استعمال کرتے ہیں جن پر گرفت نہ ہو سکے۔ چونکہ ملک میں اس انداز کے حربوں کی مدافعت کا کوئی انتظام نہیں اس لئے یہ بڑی تیزی سے پھیلتے جا رہے ہیں۔ آپ کسی نوجوان تعلیم یافتہ سے پوچھ کر دیکھئے۔ وہ متعین طور پر کبھی نہیں بتا سکے گا کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا تھا اور اس مملکت کے جداگانہ وجود کا مقصود و منتہیٰ کیا! ہمیں افسوس ہے کہ جو حضرات اپنے آپ کو بہی خواہانِ پاکستان بھی کہتے ہیں، وہ بھی (بالعموم) اپنے اپنے مفادات کے حصول کی کوششوں میں مصروف ہیں اور اس قسم کے پیدا کردہ شکوک کے ازالہ کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ جب درخت جڑ بنیاد سے اکھڑ گیا تو اس کے پھل ان کی جھولی میں کس طرح گریں گے؟

طلوعِ اسلام اس حقیقت کو ۱۹۳۸ء سے دھراتے چلا آ رہا ہے کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ نہ تو (دورِ حاضرہ کی عمومی اصطلاح کے مطابق) سیاسی تھا، نہ معاشی۔ یہ نہ ہندو کی تنگ نظری کا ردِ عمل تھا نہ مسلمان سرمایہ داروں کی حرص

مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ

مفاد پرستی کا پیدا کردہ۔ یہ خالصتہً ہمارے دین کا تقاضا اور اسلام کا مطالبہ تھا۔ قرآنِ مجید کی رُو سے، اسلام ایک زندہ حقیقت بن نہیں سکتا جب تک ایک ایسا خطۂ زمین نہ ہو جس میں کتابِ خداوندی کے احکام، آزادانہ نافذ کئے جا سکیں۔ اسے اسلامی مملکت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو اجاگر کیا اور بتایا کہ ایسی مملکت کی عمارت کا سنگِ بنیاد قرآن کا پیش کردہ یہ ابدی اصول ہے کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر، تمام غیر مسلموں سے الگ، ایک منفرد قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، نہ مسلمان اور غیر مسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں، نہ خود مسلمانوں میں مختلف قومیں ہو سکتی ہیں۔ یہی وہ قوم (اُمتِ مسلمہ) ہے جو اپنی آزاد مملکت میں قرآنی اقدار و احکام کے مطابق اپنا معاشرہ یا نظام قائم کرتی ہے۔ سیاست، معیشت، تمدن، معاشرت، غرضیکہ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبے، اسی نظام کے گوشے یا پہلو ہوتے ہیں۔

یہ تھا مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اور جس کے مطابق قائدِ اعظمؒ کی مخلصانہ سعی و کاوش سے اس نے عملی شکل اختیار کی اور مملکتِ پاکستان وجود میں آگئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ سالِ گذشتہ (۱۹۷۷ء) کے یومِ آزادی کی تقریب پر میں نے واضح کیا تھا کہ قائدِ اعظمؒ کس طرح تحریکِ پاکستان کے دوران، اور حصولِ پاکستان کے بعد، اس حقیقت کو دہراتے رہے کہ پاکستان کے آئین و قوانین کی بنیاد قرآن مجید پر ہوگی۔ (میرا یہ خطاب طلوعِ اسلام میں چھپ گیا، اور پھر الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو گیا تھا)۔ امسال میں، اس حقیقت کے دوسرے پہلو کو سامنے لانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے کس طرح، اسلام کے اس دوسرے اصول —— یعنی مسلم قومیت کے نظریہ کو، جسے اصطلاحاً دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔ اپنے مطالبہ کی بنیاد قرار دیا اور اسے اپنی عمرِ عزیز کے آخری حصہ میں، عام کرتے رہے۔ اس نظریہ کی وضاحت کی خصوصیت سے ضرورت اس لئے بھی پیش آگئی ہے کہ آجکل پھر اس فتنہ کو ہوا دی جا رہی ہے کہ قائدِ اعظمؒ، وطنیت کی بنا پر متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ قبل اس کے کہ میں قائدِ اعظمؒ کے خلاف اس ناقابلِ تصور اتہام کی طرف آؤں، ضروری معلوم دیتا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے نظریۂ قومیت کی مختصر طور پر وضاحت کر دی جائے۔ مختصر طور پر اس لئے کہ، میں گذشتہ چالیس سال میں، اس موضوع پر، تفصیلی طور پر اس قدر لکھ چکا ہوں کہ اس سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

انسانوں کی تقسیم

دنیا میں جب سے انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنے کی زندگی اختیار کی ہے انہوں نے اپنے آپ کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ شروع شروع میں انسان قبائلی زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے جُدا۔ اور مختلف قبائل ایک دوسرے کے دشمن۔ ان میں باہمی لڑائیاں اور خونریزیاں ہوتی تھیں۔ قبائلی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے قبیلہ کے کسی ایک فرد کو قتل کر دے تو اس کا جرم صرف اسی صورت میں معاف ہو سکتا تھا کہ وہ کسی دوسرے قبیلے کے دو آدمیوں کو جا کر قتل کرے۔ قبائل پھیلے تو انہوں نے نسلی تقسیم کی شکل اختیار کر لی۔ منگولی نسل کے افراد آریائی نسل کے دشمن اور آریائی نسل کے لوگ سامی نسل کے خون کے پیاسے۔ یہی امتیازات آگے بڑھے تو انہوں نے وطنی تفریق کی صورت اختیار کر لی۔ ایک خطۂ زمین میں بسنے

والے ایک قوم کے افراد اور دوسرے خطہ کے باشندے دوسری قوم کے لوگ۔ دریا کے اِس پار بسنے والے ایک قوم سے متعلق۔ اور اُس پار رہنے والے دوسری قوم کے افراد۔ اس تقسیم کو دورِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں نیشنلزم

نیشنلزم

کہتے ہیں۔ اور یہی وہ منہج زندگی ہے جس تک انسان تنہا عقل کی رُو سے بیسویں صدی تک پہنچا ہے۔ اس تقسیم کا احساس کس جذبہ پر مبنی ہے اور نیشنلزم کی دیواریں کن بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں، اس کے متعلق ہم سے نہیں بلکہ خود نیشنلزم کے پرستاروں کی زبان سے سنئے۔ پروفیسر کوبن اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILIZATION) میں لکھتا ہے کہ:-

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حقِ استقلال و خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے خود مختاری کی مدعی ہوں ...... ان وجوہات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظامِ حکومت کے لئے قومیت پرستی کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔ (ص ۱۶۶)

اس قومیت پرستی کے ہاتھوں اس وقت دنیا کس قدر جہنم کے عذاب میں گرفتار ہے۔ یہ الگ موضوع ہے، جسے ہم کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں۔[1] اس وقت صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ یہ ہے انسانوں کی تقسیم و تفریق کا وہ معیار جس تک انسان اپنی تنہا عقل کی رو سے اس وقت تک پہنچا ہے۔

قرآن کی تعلیم

لیکن وحیِ خداوندی نے کہا ہے کہ یہ معیار یکسر غلط اور وجہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ اس نے کہا کہ یہ بات کہ ایک شخص کس ماں باپ کے گھر میں پیدا ہو گیا اور اس نے کس سرزمین میں جنم لے لیا، کوئی ایسا معیار نہیں جس کی بناء پر اُسے دوسری نسل یا دوسرے ملک کے انسانوں سے الگ قرار دیدیا جائے۔ یہ تقسیم تو خالص حیوانی سطحِ زندگی کی تقسیم ہے جسے انسانیت سے کچھ واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے اعلان کیا کہ تمام دنیا کے انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ (کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً) اس لئے نسل یا وطن کی چار دیواریاں ان میں تفریق و تمیز پیدا نہیں کر سکتیں۔ ان میں تمیز پیدا کرے گی وہ چیز جو ایک انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسان سے ممتاز و متمیز کرتی ہے۔ مثلاً شریف انسان اور بدمعاش انسان ایک نہیں ہو سکتے، خواہ وہ ایک ہی باپ کے بیٹے کیوں نہ ہوں۔ جھوٹے اور سچے ایک گروہ کے افراد نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ خواہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد کیوں نہ ہوں۔ مجرم اور نیکوکار ایک جماعت سے متعلق نہیں سمجھے جا سکتے۔ خواہ وہ ایک ہی زبان کیوں نہ بولتے ہوں۔ امن پسندوں اور قانون شکنوں کو ایک نہیں خیال کیا جا سکتا خواہ وہ ایک ہی ملک میں کیوں نہ رہتے ہوں۔ ایک شریف انسان اور اس کا بدمعاش بیٹا حیوانی سطح پر (BIOLOGICALLY) باپ اور بیٹا کہلا سکتے ہیں۔ لیکن انسانیت کی سطح پر ان میں باہمی کوئی تعلق نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ ہے انسانوں میں باہمی تفریق و تقسیم

---

[1] جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ وہ اس اجمال کی تفصیل کے لئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" کا مطالعہ فرمائیں۔

کا وہ اصول جسے وحیٔ خداوندی نے عطا کیا۔ چنانچہ آپ قرآن میں دیکھئے۔ وہ کہیں (اسلامی نقطۂ نگاہ سے) عرب کی قوم یا ایران کی قوم۔ روم کی قوم یا یونان کی قوم کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ ذکر کرتا ہے قوم المجرمین اور قوم الفاسقین کا۔ قوم الظالمین اور قوم الکاذبین کا۔ جب وہ قوم المجرمین کہتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مجرم، خواہ وہ دنیا کے کسی ملک میں بستے ہوں اور کسی خاندان، نسل یا قبیلہ سے متعلق ہوں وہ سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ انہی جزئیات کو اس نے ایک عالمگیر کلیہ کے اندر سمو کر رکھ دیا جب کہا کہ دنیا کے تمام وہ لوگ جو مستقل اقدارِ انسانیت کی صداقت پہ یقین رکھتے ہوں ایک قوم کے افراد ہیں اور تمام ایسے لوگ جو اس اصول سے انکار کریں، دوسری قوم کے افراد۔ پہلی

قرآنی معیارِ قومیت

چیز اس کی اصطلاح میں ایمان کہلاتی ہے۔ اور دوسری کو کفر (یعنی انکار) کہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس نے تمام روئے زمین کے انسانوں کی تقسیم کا معیار کفر اور ایمان قرار دے دیا۔ مؤمن ایک قوم کے افراد اور غیر مؤمن دوسری قوم کے لوگ۔ یہی نوعِ انسانی کی وہ عالمگیر تقسیم ہے جس کی طرف اس نے سورۂ تغابن کی دوسری آیت میں یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ۔ (۶۴/۲)

اللہ وہ ہے جس نے تم سب انسانوں کو پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ نہ ماننے والوں (کافروں) کا ہے اور دوسرا گروہ ماننے والوں (مومنوں) کا۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں "کافر" کا لفظ ایسے گھناؤنے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ یہ ایک طرح کی گالی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے اسے ان معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اس نے اسے ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں ہم آج (NON-MEMBER) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا کے وہ تمام انسان جو ان اقدارِ انسانیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں جو وحی کی رو سے ملے ہیں (اور جواب قرآن کے اندر محفوظ ہیں) ایک گروہ۔ ایک جماعت۔ ایک قوم۔ ایک پارٹی کے ممبر ہیں۔ اور جو لوگ ان اقدار پہ یقین نہیں رکھتے وہ اس پارٹی کے ممبر نہیں ہیں — یعنی وہ (NON-MEMBERS) کافر ہیں۔ بہرحال قرآن کی رو سے دنیا کے تمام انسانوں میں قومیت کی تقسیم کا معیار اس کے نزدیک، دنیا میں قومیں صرف دو ہیں۔ مومنین کی قوم اور غیر مومنین کی قوم۔ وہ کہتا ہے کہ یہی وہ دو قومیں ہیں، جن میں شروع سے باہمی نزاع و پیکار چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ جب وہ اس ضمن میں سب سے پہلی کش مکش کا ذکر کرتا ہے جو حضرت نوحؑ کے زمانے میں سامنے آئی تو وہ کہتا ہے کہ اس میں حضرت نوحؑ ایک طرف تھے اور ان کا

ازل سے تا امروز

حقیقی بیٹا دوسری طرف۔ جب حضرت نوحؑ اپنی قوم (جماعتِ مومنین) کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے لگے تو انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور کہا کہ ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ۔ (۱۱/۴۲) "اور کافروں کے گروہ کے ساتھ نہ رہ"۔ لیکن جب وہ اپنی روشِ زندگی کو بدلنے پر آمادہ نہ ہوا تو حضرت نوحؑ (کا ہم وطن ہونا تو ایک طرف، ان) کا بیٹا ہونا بھی اس کے کسی کام نہ آیا اور وہ اپنی پارٹی والوں کے ساتھ ہلاک ہو گیا۔ اور جب حضرت نوحؑ نے خیال کیا کہ وہ ان کے اپنے خاندان (اہل) میں سے تھا تو وحیٔ خداوندی نے یہ کہہ کر اس کی صراحت کر دی کہ: اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ۔ (۱۱/۴۶) "نہیں! وہ تیرے اہل میں سے نہیں تھا"۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیمؑ کے باپ نے اس صحیح روشِ زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو آپؑ نے نہ

صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا۔ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۱۹/۴۸) "میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں"۔ اور اتنا ہی نہیں، بلکہ ان سے کہہ دیا کہ: اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ "ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو ان سب سے یکسر بے تعلق ہیں"۔ كَفَرْنَا بِكُمْ۔ "ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرنے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں"۔ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا۔ "تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہے گی"۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، اور یہ عداوت محبت سے اور یہ نفرت رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کر لو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے۔ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (۶۰/۴)

اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ: فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ (۱۴/۳۶) "جو شخص میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو ......) وہ میرے اپنوں میں سے ہے"۔ اور میرے "اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے غیر ہیں۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا۔ (۶۶/۱۰-۱۱) قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوعِ انسانی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا آیا تا آنکہ دنیا کے سامنے وہ دَور آ گیا جب وحی کی تکمیل ہو گئی۔ اور اس کے مطابق نبی اکرمؐ کے مقدس

قوم رسولِ ہاشمی

ہاتھوں ...... ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس تشکیلِ قومیت کے مطابق حبش کا بلال۔ فارس کا سلمان۔ اور روم کا صہیب (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) محمد عربی کی "اپنی قوم" کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور (حقیقی چچا) ابولہب "غیر قوم" کے افراد۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آ گیا جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے تو ان کا باپ عتبہ دوسری طرف، حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اس طرف۔ حضرت علیؓ ادھر تھے تو ان کا بھائی عقیل اُدھر۔ نہیں! اور آگے بڑھئے۔ اِدھر خود محمدؐ تھے تو ان کے مدمقابل آپؐ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص۔ یہ تھی وہ تقسیم انسانیت، جو وطن، رنگ، زبان، نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر، خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ اُمّتِ محمدیہ۔ وہ ملّتِ اسلامیہ۔ وہ جماعتِ مومنین جو دنیا کے مختلف حصوں کے اُن انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجہ اشتراک صرف ایمان تھا۔ یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹/۷۱) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں اور ان کے مقابلہ میں نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۸/۷۳) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔ اس کے بعد اس قوم مومنین کو تاکید کر دی کہ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ۔ اے جماعتِ مومنین۔ تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔ اس لئے کہ: لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا۔ یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ......

ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں اُلجھے رہو۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ۔ ان کے بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آ جاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (۳/۱۱۷) ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے) ان منافقین والوں کی حالت یہ ہے کہ: اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ۔ اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے۔ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (۳/۱۱۹) اور اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے [1]

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے متمکن (ESTABLISH) ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے ۲۴/۵۵) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکامِ خداوندی کے مطابق کرنے ہیں۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) جو ایسا نہیں کرتا، وہ مومن نہیں کافر ہے۔ (۵/۴۴) قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو قوانین مرتب کرنے پڑیں انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو۔ (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو۔ جو ان مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امورِ مملکت میں شریک و دخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہ ﷺ کی مجلسِ شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا نہ خلفائے راشدین کی پارلیمان میں کوئی غیر مسلم۔ ان کی حکومت خالصتہً جماعتِ مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس مملکت میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔ وہ "قومِ مسلم" کے افراد نہیں تھے۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی رو سے مسلم قومیت کا نظریہ جو دین میں اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبالؒ نے اسی نظریہ کو اُجاگر کیا اور اسی کو لے کر قائدِ اعظمؒ تحریکِ پاکستان کے لئے میدان میں نکلے۔ وہ اس تحریک کے دوران کس طرح اس نظریہ کو بار بار دہراتے رہے، اس کی تفصیل ابھی آپ کے سامنے آئے گی لیکن میں سب سے پہلے ان کا ایک ایسا فقرہ پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے پوری تفصیل کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر میں کہا:

قائدِ اعظمؒ کے ارشادات

> پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

بات کس قدر واضح ہے کہ جب یہاں پہلی بار ایک غیر مسلم، اسلام لے آیا، تو اس ملک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آ گیا۔ اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔ اس تقریر کے دو ہفتے بعد، انہوں نے (۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء کو) پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے

---

[1] عدمِ گنجائش کے باعث یہاں صرف انہی آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید آیات کے لئے دیکھئے ۳/۲۸، ۴/۸۹، ۴/۱۳۹، ۴/۱۴۴، ۵/۵۵، ۸/۸۳، ۹/۱۰، ۵۸/۲۲، ۶۰/۱۰-۱۱۔

ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

> میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش ہندوؤں سے الگ مستقل قوم ہیں۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے، ایڈورڈز کالج ۔ پشاور، میں ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو کہا تھا۔

> ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین، ہمیں ایک ایسا ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصوّر تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شدومد کے ساتھ ہوئی تھی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے، آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں (مارچ ۱۹۳۷ء میں) کہا تھا کہ:۔

> ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا تھا:۔

> مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔

جب قائداعظمؒ نے اس تصوّرِ قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں (مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو) ایک خط میں لکھا:۔

> میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہئیے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی کا یہ خط، یوں سمجھئے کہ قائداعظمؒ کے اس خط کے جواب میں تھا جس میں انہوں نے، مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ:۔

> اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے، نہ شک و شبہ، کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک ایک ہے۔ یہ برصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح ہے، تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے ...
>
> ... (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں) آج انسانی سعی و کاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے، آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے

تو وہ انسانی زندگی نہیں محض عزۃ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ (جناح کا خط بنام گاندھی۔ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس سنہ ۱۹۴۰ء تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائدِاعظمؒ نے فرمایا تھا۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندو مت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور ان کی بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے۔ ہندو اور مسلمان مذہب کے ہر معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ مملکت میں یکجا کر دینا باہمی منافقت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

اس کے ایک سال بعد، انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس، کے خطبۂ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائیگا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

قائدِاعظمؒ نے اس دعویٰ کو اس شد و مد سے دہرایا کہ اس کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن، مسٹر این، سی، دت نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں (جو اخبار مدینہ۔ بجنور کی یکم فروری سنہ ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی) لکھا تھا۔

ان حالات میں، میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ میرے خیال میں، اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کر کے، اسے اپنے حسبِ حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اور اس حقیقت کو، بالآخر ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا، اور دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آگیا۔ اس موضوع پر، قائدِاعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے اور بھی بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی وہ کس طرح اس حقیقت کو دہراتے رہے، اسے ذرا آگے چل کر پیش کیا جائے گا۔ اس وقت میں اس فتنہ کی طرف آنا چاہتا ہوں جسے ان

لوگوں کی طرف سے جو ہندوؤں سے علیحدگی کے غم و غصہ کی آگ اپنے سینے میں دبائے بیٹھے ہیں۔ بار بار اُچھالا جاتا ہے۔

۱۱ر اگست کی تقریر

بات یوں ہوئی کہ جب قائداعظمؒ کو، پاکستان کی پہلی مجلس آئین ساز کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے (۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء) کو اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر فرمائی۔ اس میں انہوں نے پہلے، قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف و حوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں، اس لئے وہاں ہمیشہ مسلمانوں کا خون خراب ہوتا تھا۔ پاکستان میں صورتِ حالات اس کے برعکس ہو گی۔ یہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور ہندو اقلیت میں، اس لئے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اب یہاں ان کے ساتھ وہی کچھ ہو گا جو کچھ وہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی ہندو مؤرخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا ایسا بھیانک اور دہشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا ہے جس سے ہندو عوام خوف و ہراس سے کانپ اُٹھتے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے، ان کی اسی افسانوی "تاریخ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

تمہیں لے دے کے ساری داستاں سے یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

بنابریں یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہو سکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائداعظمؒ نے اپنی اس تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہو گا۔ انہوں نے جملہ اہلِ پاکستان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:-

> تم آزاد ہو۔ تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں، یا مملکتِ پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں۔ تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو، امورِ مملکت کو اس سے کچھ تعلق نہیں ہو گا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ (اور تو اور) انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں —— رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ —— میں کس قدر کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس مملکت نے، اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے، رفتہ رفتہ ان مناقشات کو مٹا دیا، اور اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ نہیں، بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں"۔ اسی طرح :-

> میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہیئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان، مسلمان —— مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں۔ کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا، ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے، سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہو گا۔

یہ ہیں قائداعظمؒ کی تقریر کے وہ الفاظ، جنہیں، ان لوگوں کی طرف سے جنہیں پاکستان کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا، وقتاً فوقتاً اُچھالا جاتا، اور کہا جاتا ہے کہ دو قومی نظریہ کو قائداعظمؒ نے خود ہی ختم کر دیا تھا۔ لہٰذا، پاکستان میں قومیت کا معیار، اسلام نہیں، وطن کا اشتراک ہے، جس طرح دنیا کی دیگر سیکولر مملکتوں (بالخصوص ہندوستان میں) معیارِ قومیت یہی ہے۔ وہ جب بھی اس فتنہ کو ہوا دیتے ہیں تو انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ قائداعظمؒ کے ان الفاظ کو، ان کی تقریر کے سیاق و سباق سے الگ کر کے، ان سے یہ مستنبط کرنا کہ قائداعظمؒ نے اسلام کے نظریۂ قومیت کو ختم کر کے، سیکولر

نظریۂ قومیت اختیار کر لیا تھا، پاکستان اور خود قائداعظمؒ کے خلاف اس قدر زیادتی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس فتنہ کو آجکل پھر ابھارا جا رہا ہے۔ اس لئے اس (عمداً پیدا کردہ) غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ آیئے ذرا تعصب سے بالاتر ہو کر دیکھیں کہ صورت حالات کیا سامنے آتی ہے۔

صحیح صورت

(۱) سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اگر مندرجہ بالا الفاظ کسی ایسے شخص کی زبان سے نکلے ہوں، جس نے نظریۂ قومیت کے متعلق اس سے پہلے کچھ نہ کہا ہو (یا وہ متحدہ قومیت کا قائل رہا ہو) تو ان (الفاظ) سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کہنے والے کا مسلک یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں اور قومیت کا معیار مذہب نہیں، وطن ہے۔ لیکن جب اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے نکلے ہیں جو دس برس تک، انہی دو بنیادوں پر، تمام دنیا کے خلاف نبرد آزما رہا تھا تو ان سے اس قسم کے نتائج مستنبط کرنے کے لئے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے، ذرا تأمل برتنا چاہیئے۔

(۲) ہم نے بعض لوگوں کو یہاں تک کہتے بھی سنا ہے کہ بے شک قائداعظمؒ دس برس تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن یہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔

ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ کچھ ہم کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ ہم برینائے عقیدت نہیں کہتے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائداعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ ان کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنے کی کبھی جرأت نہیں کرے گا۔ حق گوئی و بے باکی، ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لنڈن ٹائمز، ان کے دوستوں کا نہیں، بہرحال دشمن قوم کا ترجمان تھا۔ اس نے قائداعظمؒ کی وفات پر لکھا تھا۔

> قائداعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصا ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

لہٰذا، یہ کہنا کہ قائداعظمؒ دس سال تک ایسے نظریات کو (بطور حیلہ سازی) پیش کرتے رہے جن پر انہیں ایمان نہیں تھا، حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ ان کا کردار اس سے بہت بلند تھا۔ جس شخص نے اپنے عمر بھر کے نیشنلزم کے عقیدہ کو جھٹک کر الگ کر دیا اور اس میں نہ مداہنت کو بار پانے دیا نہ کسی مصلحت کو، وہ اس قسم کی منافقانہ روش کبھی اختیار نہیں کر سکتا۔

(۳) ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ قائداعظمؒ نے جب مجلسِ آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے؟

پس منظر

تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف دہشت کے ایسے جذبات ابھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، پاکستان میں آ کر پناہ لے لیں۔ لیکن ان وحشی درندوں نے ان

کے نہتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ داستہ بھر قتل و غارت گری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا۔ اور تو اور، دلی سے جو گاڑیاں خود حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں، یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کے بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردّ عمل پاکستان کے بعض حصوں میں بھی ہوا۔ اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس، بے اعتمادی، اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوتے۔ آپ سوچئے کہ ایک مملکت، جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوتی ہو۔ اس قسم کے لرزہ انگیز حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ نہ اس کے پاس ابھی اپنی فوج ہو نہ اسلحہ، نہ سامان ہو نہ پیسہ، تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہوگی! اس کے ساتھ ہی اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں سے انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی۔ اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائداعظمؒ کو پاکستان میں اپنی پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائداعظمؒ بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے، لیکن جن حالات سے اس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمہ داریوں کا جو بوجھ اس مملکت پر آ پڑا تھا، اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (ہمیں اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف) شدتِ جذبات میں الفاظ کے انتخاب میں کما حقہٗ احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا، وہ اس نظریہ کو پہلے ہی دن اس طرح نذرِ آتش کر دیں گے، بڑی زیادتی ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

میں نے جو ابھی کہا ہے کہ قائداعظمؒ کی اس تقریر کا مقصد غیر مسلم اقلیتوں کو یقین دلانا تھا کہ ان سے رواداری اور حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا جائے گا، تو یہ ہماری اپنی تعبیر نہیں۔ واقعات اس کے شاہد ہیں۔ انہوں نے ۱۱ اگست کی مذکورہ بالا تقریر سے ایک ماہ پہلے، ۱۳ جولائی کو، نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے، دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ اس کانفرنس میں ان سے اقلیتوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:۔

> میں ان وعدوں سے جو میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کئے ہیں، منحرف نہیں ہوں گا۔ میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کہا ہے کہ انہیں پورا پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ میں جو بھی کہتا ہوں اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے اور جو کچھ میں کہہ چکا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اقلیتوں کو خواہ وہ کسی جماعت اور کسی فرقے سے متعلق ہوں ہر طور پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔ ان کو اپنی مذہبی رسومات وعبادات کی پوری آزادی ہوگی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ان کی جان، مال اور ان کے

تمدن کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انہیں بلا تفریق مذہب و ملت و رنگ ہر صورت میں پاکستان کا باشندہ تصور کیا جائیگا۔

(بحوالہ نوائے وقت۔ مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۷۸ء)

آپ نے دیکھا کہ قائدِ اعظمؒ نے اس میں، پاکستان کے غیر مسلم باشندوں کو اقلیتیں کہہ کر پکارا ہے۔ یہ، ان کی ۱۱ اگست کی تقریر سے ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد انہوں نے (اس تقریر کے تین ہی دن بعد) ۱۴ اگست کو مجلسِ آئین ساز کا افتتاح کیا۔

۱۱ اگست کے بعد

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے ویسا ہی کشادہ ظرفی اور رواداری کا سلوک کیا جائے گا جیسا شہنشاہِ اکبر نے کیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن کے اس مشورہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا، وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو سال پہلے سے چلا آ رہا تھا جب حضور نبی اکرمؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کر لینے کے بعد ان سے فقط ہی نہیں بلکہ عملاً انتہائی رواداری برتی اور ان کے مذہب اور عقائد کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسنِ سلوک کیا) انہی عظیم انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا اور انہی پر ہمیں بھی عمل کرنا چاہیئے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائدِ اعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس ضمن میں آپ اس نکتہ پر بھی غور فرمایئے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جن یہودیوں اور عیسائیوں سے حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا تھا، وہ مسلم قوم کا جزو نہیں بن گئے تھے۔ اسلامی مملکت میں ان کی حیثیت ذمیوں کی تھی۔ یہ حقیقت بجائے خویش اسلامی نقطۂ نگاہ سے "دو قومی نظریہ" کا بین ثبوت ہے۔

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ قریب ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے۔ جہاں جہاں بھی موقع ملا انہوں نے غیر مسلموں کو ہمیشہ اقلیت کہہ کر پکارا اور انہیں یقین دلایا کہ یہاں ان سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا۔ مثلاً انہوں نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار ابھرتا ہے، اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ میں نے جلوت اور خلوت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں سے حسنِ سلوک کا ثبوت دینا چاہیئے۔ تقسیمِ ہند کے وقت اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہٰذا جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی، انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔

پھر انہوں نے ۳۰ اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے۔ خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے اور ان کے دل میں اس حفاظت کی طرف سے کامل اعتماد پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمارا یہی رویہ ہمارے لئے باعثِ عزت اور وجہِ افتخار ہونا چاہیئے۔

۲ر فروری ۱۹۴۸ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ حکومت اس امر کا خاص اہتمام کر رہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے، خوف اور بد اعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کر دے۔" انہوں نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا:-

> اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہلِ مذاہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں۔ جو لوگ بھی یہاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کریں گے ہم ان کے اس تعاون کا گرم جوشی سے استقبال کریں گے۔

انہوں نے ۲۱ر مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

> ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کریگا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانے میں، اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور اُن کا جتنا خیال رکھا ہے، ہندوستان میں اس کی کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔ پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت ہندوستانی اقلیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا ذمہ ہے اور ہم اس ذمہ داری کو مذہب و ملت کی تمیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد انہوں نے، اسی تقریر کے دوران فرمایا:-

> اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے ——— اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے (کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں سکھایا ہے) کہ آپ کچھ بھی ہوں، اول و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں۔ تم نے اپنے لئے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ نہ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی۔ نہ سندھی کی ہے نہ پٹھان کی۔ یہ آپ سب کی ہے......
> اس لئے اگر تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبائی تفریق کے خیال کو جھٹک دیجئے۔ صوبائی تفریق ایک لعنت ہے۔ ویسی ہی لعنت جیسی لعنت فرقہ بندی۔ شیعہ سنی۔ کی تفریق ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا:-

> میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں گے۔

آپ نے دیکھا کہ اس تقریر کے پہلے اقتباس میں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں "ایک قوم" کہا ہے۔ اور دوسرے اقتباس میں، غیر مسلموں کو اقلیتیں ——— فرمائیے کہ ایسا کہنے والا "دو قومی نظریہ" کا علمبردار تھا' یا متحدہ قومیت کا؟

انہوں نے ۲۶ر مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "ایک غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کریگا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جمانے کی بھی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔"

۳ر جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ:-

> آپ کو معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلا تمیز مذہب و ملت' اور بلا لحاظ رنگ و نسل

ہر شخص کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کو اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہیئے۔

آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ ان تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیت کہہ کر پکارتے رہے۔ اور انہیں ان کی جان، مال اور عزت، آبرو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں، اس لئے اب ان میں کسی قسم کی تفریق و تمیز باقی نہیں رہی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص نظریۂ زندگی کی بنا پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اس براڈکاسٹ میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کہا کہ:-

> یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں ہم میں وحدت اور اخوت کا بڑا گہرا اور خاص جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات، ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساسات دروں کے مالک ہیں جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائداعظمؒ نے قومیت کی تشکیل کے لئے کون کون سے اجزا کو لاینفک قرار دیا؟ کیا یہ وہی اجزا نہیں جن کے امتزاج سے مسلم قوم یا امتِ مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ قائداعظمؒ نے کہیں بھی یہ کہا تھا کہ ہم (پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم) اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن چکے ہیں۔

پھر انہوں نے ۱۴ راگست ۱۹۴۸ء کو مملکتِ پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اس پیغام میں جو اُن کی زندگی کا آخری پیغام تھا پاکستان کو "دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ" کہہ کر پکارا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے اسے "مسلم سٹیٹ" کہا ہو، اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے، ہر موقعہ پر، مسلم سٹیٹ ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے ماہرینِ سیاست سے کہ جو مملکت محض وطنیت کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہو، اسے کبھی بھی، مسلم سٹیٹ، ہندو سٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جا سکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیت کی بنیادوں پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکل ہوئی ہو، اس کی مملکت ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری ایام میں متحدہ قومیت کے مؤید (مولانا) حسین احمد مدنی مرحوم نے کہا تھا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اس سے حضرتِ علامہ کے ساتھ ان کی بحث چل نکلی۔ اس بحث کے دوران علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ:-

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پرواہی۔

لہٰذا، قائداعظمؒ کا مملکتِ پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے قائل نہیں تھے۔

آخر میں آیئے ہم دیکھیں کہ قائداعظمؒ کی گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس سے قائداعظم مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر رہے ہیں، یا یہ کہ

اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ ہے، مسٹر جوشوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے (ان کا دو ایک سال اُدھر انتقال ہوا ہے) جب صدر ایوب نے لاء کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ (RATIONALE OF PAKISTAN CONSTITUTION.) (یہ پمفلٹ اس وقت ہمارے سامنے ہے) اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ سنہ ۱۹۴۰ء کی قرار داد پاکستان کی رو سے مملکتِ پاکستان کے دو بنیادی ستون تھے۔ یعنی :۔

(۱) مملکتِ پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ یہی وہ قدرِ مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ اور

(۲) اقلیتوں کے لئے تحفظات۔

انہوں نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کو یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں اس کے بعد انہوں نے قائداعظمؒ کی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء (اور اس کے ساتھ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقاریر) کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویّہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو، ہندو رہے نہ مسلمان، مسلمان۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو، جس کا لازمی نتیجہ سیکولر اندازِ حکومت ہو جائے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:۔

یہ کہنا کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے ۔۔۔۔۔۔ جو خود اس پاکستان کے خالق تھے ۔۔۔۔۔۔ اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، بالکل پاگل پن ہے۔ قائداعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب و مذہب ہر ایک کو مساوی حقوقِ شہریت حاصل ہوں گے۔

اس کے بعد انہوں نے بڑی پتے کی بات کہی تھی اور وہ یہ کہ چونکہ پاکستان کو لامحالہ ایک مذہبی مملکت بننا ہے اس لئے اس امر کا فیصلہ کہ غیر مسلم اقلیتوں کو کس قسم کے حقوق اور تحفظات حاصل ہوں گے، اسلامی فقہ کی رُو سے ہی ہو سکے گا۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں امید ہے کہ اس ضمن میں اسلامی فقہ کی تعبیر مذہبی تعصّب اور جنون کی رُو سے نہیں کی جائے گی، عقل و فکر کی رُو سے کی جائے گی۔

اس کے بعد اگر مزید شہادات کی ضرورت ہے تو ان کی بھی دو ایک مثالیں سامنے لایئے۔ سنہ ۱۹۷۱ء کی مشرقی پاکستان کی جنگ کے بعد، سقوطِ ڈھاکہ کے المیۂ جگر خراش پر شادیانے بجاتے ہوئے، بنگلہ دیش کے (اس وقت کے) قائمقام صدر، مسٹر نذرالاسلام نے اعلان فرمایا تھا کہ:۔

ہماری یہ فتح، نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے، ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے، برصغیر کے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں، اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل

اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا، جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت، تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اِس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔ حقائق کسی کے جھٹلانے، جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

اِدھر نذرالاسلام صاحب، یہ کہہ رہے تھے اور دوسری طرف (اُس زمانہ کی بھارت کی وزیرِ اعظم (مسز اندرا گاندھی، اپنی پارلیمان میں "فتح بنگالہ" پر ہدیۂ تبریک کے جواب میں یہ فرما رہی تھیں کہ:۔

یہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے۔ حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پہ قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

آپ سوچئے کہ اگر (معترضین کے قول کے مطابق) قائدِ اعظم رح نے اپنی ۱۱/ اگست کی تقریر میں، خود ہی دو قوموں کے "باطل نظریہ" کی عمارت کو مسمار کر دیا تھا تو نذرالاسلام اور مسز گاندھی کو یہ کہنے کا بڑا اچھا موقعہ تھا کہ خود قائدِ اعظم رح نے اس باطل نظریہ کی اگست ۱۹۴۷ء میں تردید کر دی تھی لیکن اس قوم (پاکستان کے مسلمانوں) نے ان کی بات بھی نہ مانی، اور اپنی ضد پر اڑی رہی، جس کا نتیجہ اب ان کے سامنے آ گیا ہے۔ انہوں نے بھی ایسا نہیں کہا جس سے واضح ہے کہ انہوں نے بھی قائدِ اعظم رح کی ۱۱/ اگست کی تقریر سے وہ مفہوم نہیں لیا تھا جو مفہوم ہمارے گھر کے پاکستان دشمن افراد لے رہے ہیں۔ یہ حضرات اشتراکِ وطن کی بنا پر، پاکستان میں متحدہ قومیت کے فتنے بیدار کر رہے ہیں۔ اور خود ہندوستان میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی قوم کو مشورہ دے رہے ہیں کہ دو قومی نظریہ ہندوستان میں بھی رائج کر دو مسٹر نراد۔ سی۔ چوہدری ہندوستان کا، بین الاقوامی شہرت کا قلم کار ہے۔ اس نے ۱۹۶۸ء میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس میں لکھا تھا:۔

میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب دوبارہ کھل کر پورے شدومد سے، مجھے یہ کہہ لینے دیجئے کہ جب تک ہندوستان کی حکومت اور ہندوستان کے ہندو یہ رٹ لگاتے رہیں گے کہ یہاں کے مسلمان ایک متحدہ قومیت کا جزو ہیں، اس وقت تک (ہندو مسلم فسادات کے) مسئلہ کو سلجھایا ہی نہیں جا سکتا ...... امرِ واقعہ یہی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ معاشرے ہیں۔ جو دو الگ الگ تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے اندر یہ اختلاف ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ..... اگر میری یہ بات مان لی جائے تو پھر اگلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں۔ (طلوعِ اسلام۔ بابت جون ۱۹۶۹ء)

اور آخر میں ہم، خود اہلِ پاکستان میں سے، ان صاحب کی شہادت بھی پیش کئے دیتے ہیں، جو تحریکِ پاکستان کے مخالفوں میں سے ہیں اور جو اب بھی بانیانِ پاکستان کے خلاف طعن و تشنیع کرتے رہتے ہیں۔ یعنی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب

——— بات یوں ہوئی کہ (فسادات پنجاب کے سلسلہ میں) منیر انکوائری کمیٹی میں، قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر بھی زیرِ بحث آگئی۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے اپنا ایک بیان کمیٹی کو بھیجا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:۔

قائدِ اعظمؒ کی اس تقریر کے الفاظ خواہ بظاہر پہلے اور دوسرے مفہوم کے حامل ہیں مگر ہمارے لئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کا منشا بھی حقیقت میں وہی تھا جو ان کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے مرتبے کے انسان سے ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ پاکستان کے قیام سے پہلے دس سال تک جن اصولوں کو بنیاد بنا کر لڑتے رہے تھے، ان سے وہ پاکستان قائم ہوتے ہی یک لخت پلٹ گئے ہوں گے۔ اور انہی اصولوں کے قائل ہو گئے ہوں گے جن کے خلاف انہوں نے اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر جنگ کی تھی۔ نیز ہم یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ وہ قیامِ پاکستان کے پہلے ہی دن یکایک اپنے ان تمام وعدوں سے پھر گئے ہوں گے جو انہوں نے بارہا صاف اور صریح الفاظ میں اپنی قوم سے کئے تھے اور جن کے اعتماد ہی پر قوم ان کو اپنا لیڈر مان کر اپنی جان و مال ان کے اشاروں پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوئی تھی۔ پھر ہمارے لئے یہ ماننا بھی ممکن نہیں ہے کہ قائدِ اعظمؒ ایسی متضاد باتیں کر سکتے تھے کہ ۱۱ اگست کو ایک اعلان کریں اور پھر اس کے بعد بارہا اس کے بالکل خلاف باتوں کا مسلمان پبلک کو یقین دلاتے رہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک ان کی مذکورہ بالا تقریر کو ان کے اگلے اور پچھلے ارشادات کی روشنی میں سمجھنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم اس کا کوئی ایسا مفہوم لیں جو ان کی تمام باتوں کے خلاف پڑتا ہے جو انہوں نے اس سے پہلے فرمائیں، اور اس کے بعد بھی فرماتے رہے۔

سب کو معلوم ہے کہ قائدِ اعظمؒ کی کانگریس سے لڑائی تھی ہی دو قومی نظریے کی بنیاد پر۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء تک ان کا مستقل نظریہ یہ تھا کہ ——— مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور وہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ وطنی قومیت نہیں بنا سکتے۔ اس کے متعلق ان کی بہت سی تحریروں اور تقریروں میں سے صرف ایک تحریر کا اقتباس میں یہاں نقل کروں گا جو ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کے ساتھ اپنی خط و کتابت کے سلسلے میں لکھی تھی۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے قائدِ اعظمؒ کی چٹھی کا اقتباس دیا تھا اور پھر لکھا تھا:۔

اب کیا ہم یہ باور کر لیں کہ ۱۱ اگست کو یک لخت وہ تمام خصوصیتیں مٹ گئیں جو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے جدا کر کے ایک الگ قوم بناتی تھیں۔ اور یکایک ایک ایسی نئی قومیت کے اسباب فراہم ہو گئے جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا جذب ہونا ممکن ہو گیا؟ اگر ہم اس بات کو مان لیں تو قائدِ اعظمؒ کو اس الزام سے بچایا نہیں جا سکتا کہ وہ ایک با اصول آدمی نہ تھے بلکہ محض سیاسی مصلحتوں کی خاطر اصول بناتے اور بدلتے رہتے تھے۔ مرحوم کی وفات کے پانچ سال بعد ان کی روح کو ایسے الزامات کا تحفہ پیش کرنے کے لئے میں تو کسی طرح تیار نہیں ہو سکتا۔

(بحوالہ ایشیا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۶ء)

یہ جو کچھ مودودی صاحب نے قائدِ اعظمؒ کی زیرِ بحث تقریر کے مفہوم کے متعلق کہا تھا ——— یہ الگ بات ہے بعد میں انہوں نے خود ہی نظامِ جمہوریت، کو عین مطابق اسلام قرار دے دیا جس میں امورِ مملکت کے فیصلے ملک (مسلم اور غیر مسلم آبادی کی) اکثریت کی رو سے ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت ہونے والے انتخابات کے سلسلہ میں فرمایا تھا کہ:۔

اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعت اسلامی اس کی حمایت نہیں کرے گی۔ کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں۔ اس کے برعکس اگر ایک ہندو، جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی، اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق

ہونا چاہیئے ج۱

(طلوعِ اسلام - نومبر سنہ ۱۹۷۰ء - صفحہ ۷۷)

یہ ہے دو قومی نظریہ کے متعلق قائداعظم ؒ کے دعاوی اور مسلک کی وضاحت - اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ وہ، تحریکِ پاکستان کے یومِ اوّل سے لے کر اپنی زندگی کے آخری سانس تک اس نظریہ کے حامی رہے - یہ اس لئے کہ وہ اسے اسلام کا بنیادی اور مملکتِ پاکستان کے جواز کی خشتِ اول سمجھتے تھے۔

لیکن ہم، ان حضرات کی خدمت میں، جو ان تمام تصریحات کے باوجود، اپنی ضد پہ اڑے رہنا چاہتے ہیں۔ (کہ قائدِ اعظمؒ نے اپنی ۱۱ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کی تقریر میں اس نظریہ کا ابطال کر دیا تھا) ایک گذارش کرنا چاہتے ہیں - اور وہ یہ کہ فرض کر لیجئے کہ (جیسا کہ آپ کہتے ہیں - اور بالکل غلط کہتے ہیں) قائدِاعظمؒ نے اس نظریہ سے رجوع کر لیا تھا، تو اس سے اصل حقیقت پہ کیا اثر پڑتا ہے؟ جیسا کہ ہم شروع میں بتا چکے ہیں، دو قومی نظریہ، اسلام کا بنیادی اصول ہے - ہم ان حضرات سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا آپ اسے اسلام کا اصول مانتے ہیں یا اس سے بھی انکار کرتے ہیں؟ اگر آپ اسے اسلام کا اصول تسلیم کرتے ہیں تو یہ سوال درخورِ اعتنا ہی نہیں ہونا چاہیئے کہ کس نے اسے قبول کیا اور کس نے مسترد کر دیا - اور اگر آپ اسے اسلام کا اصول تسلیم نہیں کرتے تو پھر آپ کو اپنے اس عقیدہ کی تائید میں قائدِ اعظمؒ کو بطورِ سند پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ قائدِاعظمؒ کو ان کے حال پہ چھوڑ دیجئے اور صاف صاف بات کیجئے کہ آپ دو قومی نظریہ کو مطابقِ اسلام سمجھتے ہیں یا متحدہ قومیت کو؟ یہ اس لئے کہ مملکتِ پاکستان کو اسلام کے نام پہ حاصل کیا گیا تھا اور آئین میں بھی اسے "اسلامی" کہہ کر پکارا گیا ہے اس لئے یہاں، امورِ مملکت سے متعلق تمام باتیں، اسلام کے حوالے سے ہونی چاہئیں - فرمایئے! اسلام کے حوالے سے اس باب میں آپ کا کیا مسلک ہے؟

لیکن ہمیں ان سے کیا گلہ ہے جبکہ خود ان حضرات نے جن کے ہاتھ میں پاکستان کی زمامِ اقتدار رہی ہے، دو قومی نظریہ سے عملاً انحراف برتا ہے۔ پاکستان میں اس وقت تک تین آئین بن چکے ہیں - ان میں سے کسی آئین میں بھی، پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو الگ قوم قرار نہیں دیا گیا۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں کو پاکستانی قوم کے افراد شمار کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۷۳ء کے آئین پر تو پارٹیوں کے پارلیمانی نمائندوں نے دستخط کئے تھے۔ جب علمبردارانِ پاکستان کی خود اپنی یہ کیفیت ہے تو پاکستان سے بغض اور عداوت رکھنے والوں سے کیا گلہ!

لیکن یہ ہوں یا وہ - جو بھی دو قومی نظریہ کی مخالفت کرے گا وہ کسی صورت میں پاکستان کا بہی خواہ قرار نہیں پا سکتا - اس مملکت کی وجہِ جواز دو قومی نظریہ اور قرآنی نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے، بھی انکار یا انحراف، مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہے۔

ح۱ یہ اور بات ہے کہ مودودی صاحب پہلے فرما چکے ہیں کہ اسلامی ریاست میں "جو اسمبلی شوریٰ کے لئے منتخب کی جائے گی اس میں بھی اہلِ ذمہ کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ملے گا۔" (اسلامی ریاست سنہ ۱۹۶۷ء ایڈیشن - صفحہ ۵۲۵)۔ ان کا اسلام مجموعۂ اضداد ہے!

انتخابات

آخر میں، میں اس سوال کی طرف آنا چاہتا ہوں جس نے آجکل پھر خاص طور پر اہمیت اختیار کر لی ہے یا اسے دانستہ ابھارا جا رہا ہے۔ یعنی یہ سوال کہ انتخابات مخلوط ہونے چاہئیں یا جداگانہ۔ یہ مسئلہ بڑا صاف اور سادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس سوال کا جواب اسلامی مملکت کے حوالے سے معلوم کرنا چاہتے ہیں یا سیکولر مملکت کے حوالے سے۔ اگر آپ کو سیکولر مملکت کے حوالہ سے اس کا جواب مطلوب ہے تو وہ بہت آسان ہے۔ سیکولر مملکت میں، حدود مملکت کے اندر بسنے والے تمام باشندے (مسلم اور غیر مسلم) ایک قوم ہوتے ہیں، اور ایک قوم میں مخلوط یا جداگانہ انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ساری قوم کے لئے ایک ہی طریق انتخاب ہوتا ہے۔ اور اگر آپ اسلامی مملکت کے حوالے سے جواب معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو بھی مسئلہ صاف اور سادہ ہے۔ اسلامی مملکت میں۔

(۱) مملکت صرف مسلموں کی ہوتی ہے، مسلم اور غیر مسلموں کی مخلوط نہیں ہوتی۔ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۴/۵۵) کی قرآنی نص صریح اس کی شاہد ہے۔

(۲) اس مملکت میں معاملات، صرف مسلموں کے باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) میں "بَيْنَهُمْ" (ان کے اپنے باہمی مشورہ سے) کی شرط بڑی اہم اور بنیادی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن بالفاظ صریح کہتا ہے کہ غیر مسلموں کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔ آیت (۳/۱۱۷) پہلے گذر چکی ہے۔

(۳) اسلامی مملکت کے جملہ امور، حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پاتے ہیں، اس لئے غیر مسلم، جو حدود اللہ پر ایمان ہی نہیں رکھتے، اس کے شریک حکم نہیں ہو سکتے۔

لہٰذا، اسلامی مملکت میں غیر مسلم، نہ ووٹ کے اہل ہو سکتے ہیں، نہ رکنیت کے۔ مملکت میں ان کی حیثیت ذمیوں کی ہوتی ہے۔ یعنی وہ جن کے جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو۔ مذہب۔ معابد کی حفاظت کی ذمہ داری، مملکت کے ذمے ہوتی ہے۔ ان کی حیثیت ایک (COMMUNITY) کی ہوتی ہے۔ قوم کی نہیں۔ اسلامی مملکت میں قوم ایک ہی ہوتی ہے، یعنی مسلمانوں کی۔ غیر مسلم، اس قوم کے افراد نہیں ہوتے۔ وہ صرف ایک سوسائٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔*

ان تصریحات کی روشنی میں، اسلامی مملکت میں بھی، جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ہم ان ارباب سیاست سے، جو جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا سوال ابھار رہے ہیں، گذارش کریں گے کہ وہ دوٹوک الفاظ میں واضح کریں کہ وہ پاکستان کو کیسی مملکت سمجھتے ہیں۔ سیکولر یا اسلامی۔ اس جواب کی روشنی میں اس مسئلہ کا واضح جواب مل جائے گا۔ اگر آپ اسے سیکولر مملکت کہتے ہیں تو پھر اس کے جداگانہ مملکت رہنے کا جواز بھی باقی نہیں رہتا۔ جواب دیتے وقت اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے۔

---

* اس مقام پر ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ برصغیر متحدہ ہندوستان میں ہم نے "دو قومی نظریہ" کی اصطلاح اس لئے اختیار کی تھی کہ ہندوؤں کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے اور ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ وہاں ایک قوم نہیں بستی دو قومیں بستی ہیں۔ ایک قوم مسلمانوں پر مشتمل ہے اور دوسری قوم وہاں کے غیر مسلم باشندوں پر۔ پاکستان میں ہمیں "دو قومی" اصطلاح استعمال نہیں کرنی چاہیئے۔ یہاں قوم صرف ایک ہے جو تمام کی تمام مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ غیر مسلم کوئی قوم نہیں۔ یہ پاکستان میں بسنے والی ایک سوسائٹی ہے جسے فقہی اصطلاح میں اہل الذمہ یا ذمی کہا جاتا ہے۔ یہاں اب مسلم قوم اور سندھی بھی بستے ہیں۔ پاکستانی قوم سے مراد بھی صرف مسلم قوم ہوگی۔ آئین پاکستان میں اس کی وضاحت کرنی چاہیئے۔ ان حضرات سے سنا گیا ہے کہ اس زمانے میں کسی مملکت میں اس قسم کی پوزیشن تو بڑی انوکھی سی بات ہے۔ ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس دور میں سب سے انوکھی بات تو مذہب کی بنیادوں پر مملکت کا قیام ہے۔ جب آپ نے اس انوکھے مطالبہ پر مملکت حاصل کی ہے تو پھر اس کے تقاضات کے انوکھے پن سے کیوں گھبراتے ہیں؟ اصل یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اسلام کے نام پر مملکت تو حاصل کر لی لیکن مملکت کا تصور ہمارے ذہنوں میں وہی مغربی سیکولر سٹیٹ کا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے اس قسم کی ثنویت (DUALISM) شرک ہے اور شرک کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ قوموں کے دیگر جرائم تو قابل عفو ہو سکتے ہیں، شرک قابل عفو نہیں ہوتا (۴/۴۸) اور اس جرم کی سزا بڑی سخت ہے۔ یعنی خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) اس دنیا میں ذلت و خواری اور آخروی زندگی میں شدید ترین عذاب۔

یہ فارمولا کس کا ہے؟

پچھلے دنوں (فروری ۱۹۷۸ء میں) مسٹر محمد حنیف رامے نے، ملک کی سیاسی الجھنیں دور کرنے کے لئے، ایک تجویز پیش کی جس میں کہا کہ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کو فوری طور پر توڑ دیا جائے اور ملک میں غیر جماعتی پارلیمانی نظام قائم کر کے جمہوریت بحال کر دی جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کا یہ حل قرآن کے قول اور حضرت محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عمل کے عین مطابق ہے۔ (بحوالہ ہفت روزہ "زندگی" لاہور۔ مورخہ ۲۴ فروری تا ۲ مارچ ۱۹۷۸ء)۔

ہمیں نہ تو رامے صاحب سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی ان کی سیاست سے کوئی واسطہ۔ ہم نے جس وجہ سے اس موضوع کو درخورِ اعتنا سمجھا ہے وہ اور ہے۔ معاصر "زندگی" نے رامے صاحب کی اس تجویز کو، حسبِ ذیل عنوان کے تحت (جسے نہایت جلی حروف میں لکھا گیا ہے) شائع کیا ہے۔

حنیف رامے کا پرویزی فارمولا

اس عنوان کے تحت تبصرہ میں کہا گیا ہے:۔

حنیف رامے نے دراصل کوئی نیا سیاسی فلسفہ پیش نہیں کیا۔ اس کے تجویز کردہ "امرت دھارے" کا فارمولا جناب غلام احمد پرویز برسوں سے پیش کر رہے ہیں۔ ان کا (رامے صاحب کا) کمال یہ ہے کہ خاص قسم کے سیاسی حالات میں وہ اسے "طلوعِ اسلام" کے صفحات سے اٹھا کر اخبارات کے کالموں تک لے آتے ہیں۔ "طلوعِ اسلام" کے اکتوبر۔ نومبر ۱۹۷۶ء کے شمارے میں پرویز صاحب نے ص۵ پر قرآنی نظام کے عناصرِ ترکیبی کے ذیل میں یہی باتیں ان الفاظ میں پیش کی ہیں۔

- یہ طور طریقے (مسلم افرادِ مملکت) کے باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔ اس مشورہ کے لئے اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کوئی سا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ اُمت میں نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ، اس لئے مجلسِ مشاورت کے اراکین کا انتخاب، قرآنی نقطۂ نگاہ سے اہلیت اور صلاحیت ہوتا ہے۔
- اس مجلسِ مشاورت (پارلیمان) میں نہ حزبِ اقتدار ہوتا ہے نہ حزبِ اختلاف۔ نہ ہی اس میں اقتدار کسی خاص طبقے کو حاصل ہوتا ہے۔

(لاہور کی ڈائری۔ از۔ ممتاز عامر۔ ہفت روزہ زندگی)

اس کے بعد ہمارے سامنے، ہفت روزہ "اسلامی جمہوریہ" کا ۲۸، فروری تا ۵، مارچ ۱۹۷۸ء کا شمارہ آیا۔ اس میں راقمے صاحب کی محولہ بالا تجویز کی مختلف شقیں درج کرنے کے بعد کہا گیا ہے۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر جماعتی انتخابات اور غیر جماعتی جمہوریت کی بات موجودہ حالات سے متاثر ہو کر نہیں کہی جا رہی بلکہ ایک نئے اسلامی مکتبِ فکر کو روشناس کرایا جا رہا ہے۔ یہ مکتبِ فکر وہی ہے، جو غلام احمد پرویز صاحب پیش کر چکے ہیں۔ پرویزی نقطۂ نظر سے سیاسی جماعتیں بنانا نہ صرف ناجائز بلکہ "شرک" ہے۔ وہ غلام محمد اور اسکندر مرزا سے بارہا یہ اپیلیں، "طلوع اسلام" میں کرتے رہے ہیں کہ تمام سیاسی جماعتوں کو ممنوع قرار دے کر ملت کو تفرقہ آرائی اور شرک سے بچایا جائے۔ جناب راقمے بھی یہی بات کہہ رہے ہیں۔

ہم ان تنقیدات کا صرف اس حد تک جائزہ لینا چاہتے ہیں جس حد تک انہیں پرویز صاحب (یا طلوع اسلام) کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ان میں کہا یہ گیا ہے کہ:۔

(۱) یہ دعویٰ کہ اسلام میں سیاسی پارٹیوں یا مذہبی فرقوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، "پرویزی فارمولا" ہے۔ اور

(۲) یہ ایک نیا اسلامی مکتبِ فکر ہے جسے پرویز صاحب پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔

آیئے، ہم دیکھیں کہ یہ "فارمولا" درحقیقت کس کا ہے، اور اس "مکتبِ فکر" کا سرچشمہ کونسا ہے؟

قرآن کریم خدا کی کتاب ہے جو نبی آخر الزمان (صلے اللہ علیہ وسلم) کے حسن توسط سے نوعِ انسان کی ابدی ہدایت کے لئے دنیا کو ملی ہے۔ جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں، اس کے ارشادات ان کے لئے دین میں آخری سند اور حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا، ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اس نہایت اہم سوال کے متعلق (کہ اُمتِ مسلمہ میں سیاسی پارٹیوں یا مذہبی فرقوں کی اجازت ہے یا نہیں) قرآن کریم کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم اس باب میں، لمبی چوڑی بحث کے بجائے، قرآن مجید کی متعلقہ آیات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ انہیں بغور ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اصولی طور پر، تمام نوعِ انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور اس تقسیم و تفریق کا معیار، کفر اور ایمان ہے۔ ارشاد ہے۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ۔ (۶۴/۲) "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں (نوعِ انسان کو) پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہے اور ایک گروہ مؤمنین کا۔" یہاں دیکھئے۔ تمام کے تمام مؤمنین کو ایک گروہ قرار دیا گیا ہے جس میں کسی قسم کی تفریق و تقسیم کا شائبہ تک نہیں۔

۲۔ جو لوگ رسالتِ محمدیہ پر ایمان لا کر حلقۂ مومنین میں داخل ہوئے، انہیں قرآن کریم نے "ایک اُمت" قرار دیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:۔

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا۔ (۲/۱۴۳)

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امتِ معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔
(ترجمہ۔ شیخ الہندؒ)

اس آیۂ جلیلہ میں دیکھئے:۔

(ا) جَعَلْنٰكُمْ۔ جعلنا سے واضح ہے کہ خدا نے مومنین کو ایسا بنایا ہے۔ اور کُمْ کی ضمیر جمع مخاطب سے ظاہر ہے کہ اس میں تمام کے تمام مؤمنین شامل ہیں۔ ان سب کو خدا نے کیا بنایا ہے؟ اُمَّةً۔ ایک اُمت!

(ب) جتنے انسان (الناس) اس اُمت سے باہر ہیں ان سب پر اس اُمت کو گواہ بنایا گیا ہے۔

(ج) اور الرَّسُوْلُ، اس پوری کی پوری اُمت پر (عَلَيْكُمْ) شہید ہے۔

ایک رسول۔ اور اس پر ایمان لانے والی ایک اُمت۔

۳۔ اس اُمت کے متعلق سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ..... (۳/۱۱۰)

تم ہو بہتر سب اُمتوں سے جو بھیجی گئیں عالم میں۔ (ترجمہ۔ شیخ الہندؒ)

كُنْتُمْ۔ تمام کے تمام مؤمنین کے لئے ہے۔ یہ سب مؤمن مل کر خَيْرَ اُمَّةٍ بنتے ہیں۔

۴۔ اس اُمت سے تاکید کی گئی کہ:۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۪ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۪ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (۳/۱۰۳)

تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو۔ تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی اور اس طرح تم، اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ تم (اس سے پہلے) آگ کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اللہ اس طرح اپنی آیات کی تمہارے لئے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم راہِ ہدایت پر رہو۔

اس آیت سے حسبِ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:۔

(ا) اعتصام بحبل اللہ (یعنی کتاب اللہ کو تھامنے) کی تاکید تمام اُمت کو ہے۔ (جَمِيْعًا کا لفظ اس کی وضاحت کرتا ہے)۔

(ب) لَا تَفَرَّقُوْا ــــــ آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو۔ ظاہر ہے کہ فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جانے سے بڑھ کر تفرقہ کیا ہو سکتا ہے؟

(ج) تفرقہ سے باہمی عداوت پیدا ہوتی ہے جو عذاب النار (جہنم) میں لے جانے کا موجب ہے۔

(د) اس تفرقہ سے بچا کر انہیں امتِ واحدہ بنا دینا خدا کی نعمت ہے۔

(س) یہ اُمت افرادِ مومنین کے دلوں میں باہمی اُلفت سے متشکل ہوتی ہے۔

(ص) اس طرح یہ افرادِ اُمت، ایک دوسرے کے بھائی بن جاتے ہیں۔
یعنی — تفرقہ کی جگہ جمعیت۔ عداوت کی جگہ اُلفت۔ انفرادیت کی جگہ اجتماعیت اور رسمی تعلقات کے بجائے، اخوت۔ یہ ہیں اس امت کی خصوصیات۔ اسے دوسری جگہ۔ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ۔ (۶۱/۴) سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔

۵۔ مندرجہ آیت کے بعد دوسری آیت میں کہا گیا ہے:۔
وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ، وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ — يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ، فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ — وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ (۳/۱۰۵-۱۰۷)

(اے مسلمانو! دیکھنا) ان واضح احکام کے آجانے کے بعد تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جو فرقوں میں بٹ گئے، اور باہمی اختلاف کرنے لگ گئے۔ یہ لوگ عذابِ عظیم میں مبتلا ہوں گے۔

جس دن بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض سیاہ۔ جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے، ان سے کہا جائے گا کہ (یہ اس لیے ہوا کہ) تم لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا۔ لہٰذا، تم اپنے کفر کی وجہ سے عذاب کا مزہ چکھو۔

اور جن لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے ان پر خدا کی رحمت ہوگی۔ اور وہ اس حالت میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ:۔
(ا) فرقہ بندی اور باہمی اختلاف خدا کے عذاب کا موجب ہیں۔
(ب) یہ، ایمان کے بعد کفر اختیار کر لینے کے مرادف ہے اور روسیاہی کا باعث۔
(ج) اختلاف اور تفرقہ نہ پیدا کرنے والے رحمتِ خداوندی کے مستحق ہیں۔

۶۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے کہ انبیاء کرام ؑ کو جو دین دیا جاتا تھا اس میں تاکید کی جاتی تھی کہ: أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ۔ (۴۲/۱۳) "وہ دین کو قائم کریں اور اس میں تفرقہ پیدا کریں"۔ لیکن، كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ۔ (۴۲/۱۳) "ان کی یہ دعوت کہ تفرقہ چھوڑ کر دین کی بنیادوں پر ایک امت بن جائیں، مشرکین کو بڑی ناگوار گزرتی تھی"۔ وہ بہر حال، اپنے متبعین کو، اس دعوت کی بنا پر ایک "امتِ واحدہ" بنا کر چلے جاتے تھے۔ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ — (۴۲/۱۴) لیکن ان کے جانے کے بعد وہ، باہمی ضد اور تعصب کی بنا پر تفرقہ پیدا کر لیتے تھے حالانکہ اَلْعِلْمُ (وحیِ خداوندی) ان کے پاس ہوتا تھا۔

اس سے واضح ہے کہ:۔

(ا) دین کی بنیادوں پر وحدتِ اُمت، وحیٔ خداوندی کی بنیادی تعلیم تھی۔
(ب) مشرکین پر اس قسم کی وحدت بڑی گراں گزرتی تھی۔ (تفصیل اس ـــــــ کی ذرا آگے چل کر زیرِ آیت (۳/۱۳۱) سامنے آئے گی)۔
(ج) رسولوں کے چلے جانے کے بعد، اُن کی اُمت، وحی کی تعلیم کے علی الرغم، فرقوں میں بٹ جاتی تھی اور اس کی وجہ مذہبی پیشواؤں کی باہمی ضد اور تعصب تھا۔

۷۔ حضورؐ نے (بزبانِ وحی) اپنی امت سے تاکید کر دی تھی۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (۶/۱۵۳)

(اچھی طرح دیکھو اور سمجھ لو) یہ ہے میرا سیدھا اور صاف راستہ۔ سو تم اس راستے کا اتباع کرو۔ دوسرے راستوں کا اتباع مت کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو وہ راستے تمہیں خدا کی طرف جانے والے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ خدا نے تمہیں یہ حکم اس لئے دیا ہے کہ تم تقویٰ شعار رہو۔

اس سے واضح ہے کہ:۔

(ا) خدا کی طرف لے جانے والا راستہ ایک ہی ہے۔ اسی پر حضورؐ گامزن تھے اور اسی پر چلنے کی تاکید اُمت سے کی گئی تھی۔ فرقہ بندی میں ہر فرقہ الگ الگ راستہ اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح خدا کی طرف لے جانے والا راستہ نگاہوں سے گم ہو جاتا ہے۔
(ب) صراطِ مستقیم، جس پر چلنے کی ہر نماز میں دعا مانگی جاتی ہے، ایک ہی ہے۔ متفرق راستوں میں سے کوئی بھی صراطِ مستقیم نہیں ہو سکتا۔

۸۔ ان تصریحات کے بعد، سورۂ روم میں جامع طور پر فرمایا:۔

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ـــ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

(اے جماعتِ مومنین۔ تم مومن ہونے کے بعد) شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے تفرقہ ڈالا اپنے دین میں۔ اور ہو گئے ان میں بہت فرقے۔ ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے اس پر خوش ہے۔ (ترجمہ۔ شیخ الہندؒ)

اس جامع آیت سے واضح ہے کہ:۔

(ا) دین میں تفرقہ پیدا کرنا مشرکین کا شیوہ ہے۔
(ب) تفرقہ کے معنی ہیں فرقہ بندی۔
(ج) یہ امر مسلّمہ ہے کہ اسلام میں "مذہب اور سیاست" میں ثنویت نہیں۔ لہٰذا، "دین میں تفرقہ" کے اندر، مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں دونوں آ جاتی ہیں۔ (فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ ۔ كَانُوْا شِيَعًا اور كُلُّ حِزْبٍ کے الفاظ اس کی وضاحت کرتے ہیں)۔ قرآن کریم نے فرقوں کے خلاف جو سنگین ترین جرم عائد کیا ہے وہ یہ ہے

کہ، وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ ۔ (۲۸/۴) " وہ مملکت کے باشندوں (بنی اسرائیل) کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا۔ کبھی ایک پارٹی کو کمزور کر دیتا تھا، کبھی دوسری پارٹی کو۔" لہٰذا، پارٹی سازی، حکمتِ فرعونی ہے جس کی جڑ کاٹنے کے لئے، صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰؑ کو اس کی طرف بھیجا گیا تھا۔

۹۔ یہ سب کچھ کہہ دینے کے بعد، اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۵۹)

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔ اے رسول! تیرا ان سے کوئی سروکار نہیں۔

بات صاف ہو گئی کہ دین میں تفرقہ پیدا کر کے، پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ جانے والوں کے ساتھ رسول اللہ کو کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ مسلمان، رسول اللہؐ کی نسبت سے، اُمتِ محمدیہ بنتے ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ رسول اللہ کا واسطہ نہ رہے، ظاہر ہے کہ وہ اُمتِ محمدیہ کے دائرے سے خارج ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ خدا نے کہا ہے۔ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ (۲۲/۷۸) خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ فرقوں میں کوئی شخص صرف مسلم (یا مسلمان) کی نسبت سے متعارف نہیں ہوتا۔ وہ اپنے فرقہ کے تخصیصی نام سے پہچانا جاتا ہے۔

۱۱۔ خدا نے جماعتِ مومنین کو حزب اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خدا کی پارٹی۔ اور غیر مسلموں کو حزب الشیطان یعنی شیطان کی پارٹی (۵۸/۱۹، ۲۲)۔ لہٰذا، قرآن کی رو سے پارٹیاں ـــــ دو ہی ہو سکتی ہیں۔ حزب اللہ یا حزب الشیطان۔ لہٰذا، اسلام میں حزب کے بجائے احزاب (پارٹیوں) کا تصور ہی باطل ہے۔

قرآنِ کریم سے تفرقہ (مذہبی فرقہ بندی ہو یا سیاسی پارٹی بازی) کے خلاف اور بھی متعدد شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں، لیکن ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی ان نصوصِ صریحہ کی روشنی میں دیکھئے کہ کیا اسلام میں مذہبی فرقوں یا سیاسی پارٹیوں کے جواز کا شائبہ تک بھی ملتا ہے؟ جس تفرقہ کو قرآن کفر اور شرک قرار دیتا ہے، کیا وہ اسے کسی صورت میں بھی جائز قرار دے سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں آپ کو نہ کسی مذہبی فرقہ کا نشان ملتا ہے نہ سیاسی پارٹی کا۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ (جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے)۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے مقتدیوں کے ساتھ الگ جماعت کرا رہے ہوں اور حضرت عمرؓ الگ! کیا آپ کو کہیں بھی یہ لکھا ملتا ہے کہ صحابہؓ کے مختلف گروہ مختلف فقہوں کے پابند تھے۔ یا کیا آپ کو اُس عہد کی پارلیمان (مجلسِ مشاورت) میں اس قسم کا منظر دکھائی دیتا ہے کہ حزبِ اقتدار خلیفۃ المسلمین کے زیرِ قیادت ایک طرف ہو، اور ان کے بالمقابل کسی دوسرے صحابیؓ کے زیرِ قیادت، حزبِ مخالف، دوسری طرف! اور تو اور کیا حضرت سعدؓ نے انتخاب میں حضرت ابوبکرؓ سے "شکست کھا کر" کوئی الگ پارٹی بنا لی تھی؟ وہ حضرات (رضی اللہ عنہم) فرقہ بندی اور پارٹی سازی کے خلاف احکاماتِ خداوندی سے واقف تھے۔ اسی لئے وہ جماعت میں تفرقہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جو مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (۴۸/۲۹) کہا ہے تو وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (حضورؐ کے رفقاءؓ) میں تمام کے تمام مومنین شامل تھے اور رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ان کی خصوصیتِ کبریٰ تھی۔ یعنی ایک دوسرے

کے انتہائی غم خوار اور غم گسار۔ کیا ایسی جماعت میں تفرقہ کا شائبہ تک بھی پیدا ہو سکتا ہے؟ حضورؐ کے زمانے میں منافقین نے اُمت میں تفریق پیدا کرنے کی ایک سازش کی تھی؛ سازش کی شکل کیا تھی؟ وہی جو مذہبی پیرہن میں ہوتی ہے۔ یعنی انہوں نے ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ آپ سوچیے کہ کیا مسجد کی تعمیر بھی سازش اور جرم قرار پا سکتی ہے؟ لیکن وہ ایسی تخریبی سازش تھی کہ قرآن کریم نے اس واقعہ کو اپنے دامن میں محفوظ کر کے، اسے امت مسلمہ کے لئے قیامت تک کے لئے آیۂ عبرت قرار دیا ہے۔ سنیئے کہ قرآن کریم اس واقعہ کا ذکر کن الفاظ میں کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ۔ (9/107) ذرا سوچو کہ ان لوگوں نے کس قدر گہری چال چلی ہے۔ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کر ڈالی ہے تاکہ یہ ظاہر کیا جائے کہ یہ اسلام کے بڑے خدمتگذار ہیں۔ لیکن اس سے درحقیقت ان کا مقصد یہ ہے کہ اس نظام کو نقصان پہنچایا جائے۔ اور کفر کی راہیں کشادہ کی جائیں۔ یعنی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کیا جائے۔ یہ مسجد نہیں۔ یہ ان لوگوں کے لئے کمین گاہ ہے جو خدا اور رسولؐ کے خلاف مصروف پیکار ہیں۔

غور کیجئے کہ (اور تو اور) جو مسجد بھی مسلمانوں میں تفرقہ کا موجب بن جائے اس کے متعلق خدا کا کیا فیصلہ ہے۔ وہ اسے کفر قرار دیتا ہے۔ وہ اسے خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں کے لئے کمین گاہ کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ ۖ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ۔ (9/107) یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم نے اس مسجد کو بڑی حسن نیت سے تعمیر کیا ہے۔ لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ بڑے جھوٹے ہیں۔

چنانچہ اس کے بعد حضورؐ سے فرمایا گیا کہ: لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا۔ (9/108) "اے رسول! تم اس مسجد میں قدم تک نہ رکھنا"۔ اور تاریخ میں ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ کو حکم دے کر اس مسجد کو منہدم کر کے خاک سیاہ کر دیا۔ اس سے اگلی دو آیتوں میں اس کی مزید تشریح ہے کہ امتِ مسلمہ میں تفرقہ پیدا کرنے والے کس طرح جہنم کی آگ میں جلتے ہیں۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں، قرآن کے ارشادات، فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے متعلق۔ اس کے بعد ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں، جنہوں نے اس حقیقت کو "پرویزی فارمولا" کہہ کر طعن و استہزا کا ہدف بنایا کہ یہ فارمولا کس کا فارمولا ہے؟ یہ پرویز کا فارمولا ہے یا خود خدا کا متعین فرمودہ فارمولا؟...... کیا یہ ایک نیا مکتبِ فکر ہے یا اس مکتب کی نشاۃ ثانیہ جسے نوعِ انسان کے معلم کبریٰ (حضور نبی اکرمؐ) نے قائم فرمایا تھا! اس کے بعد آپ سوچیے کہ ان حضرات کے نشترِ طعن و تشنیع اور سنانِ استہزاء و ملامت کی زد کہاں تک پہنچتی ہے؟ "اسلامی جمہوریہ" نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ایسا نظریہ پیش کرنے والے درحقیقت "فاشسٹ عنصر کے آلۂ کار" ہیں! اللہ اکبر! امت نے یہ دن بھی دیکھنے تھے کہ وحدتِ اُمت کا قرآنی نظریہ پیش کرنے والے فاشسٹ عنصر کے آلۂ کار ٹھہرائے جائیں گے! اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:-

> پھر سوال یہ ہے کہ مذہبی جماعتیں اور مذہبی فرقے کس طرح ختم کئے جا سکتے ہیں۔

یعنی سوال یہ نہیں کہ مذہبی فرقے اسلام کی رو سے جائز ہیں یا نہیں۔ وہ جائز ہوں یا ناجائز، جب وہ موجود ہیں اور

(بقول ان کے) مٹائے نہیں جا سکتے، تو پھر ان پر اعتراض کیوں کیا جائے؟ آپ اس اندازِ استدلال پر غور فرمایئے۔ یعنی ایک چیز جسے قرآن کفر اور شرک قرار دے رہا ہے، جب مسلمانوں میں موجود ہے، اور اسے مٹایا بھی نہیں جا سکتا، تو اس کی مخالفت کیوں کی جائے؟ اسے رہنے دیا جائے۔ بجنتہ نہ کیا جائے۔ اسے خدا کی رحمت[1] قرار دیا جائے! یہ ہوگی اسلام کی خدمت! یا دینا!!

"اسلامی جمہوریہ" میں ایک مقام پر مودودی صاحب کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ اگر ان حضرات کے نزدیک مودودی صاحب کا ارشاد سند ہے تو مسلمانوں میں پارٹیاں بنانے کے متعلق ان کا فیصلہ بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ وہ اپنی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش"۔ حصہ اوّل۔ چھٹا ایڈیشن صفحہ ۵۹ پر رقمطراز ہیں:-

> یہ (مسلمان) قوم پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت، الگ نام سے بنانا، اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی، یا کسی ظاہری علامت، یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا، اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا، یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسری قوموں کے مزاج کے موافق آتی ہیں، وہ مسلمان قوم کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔ اس قوم کو اگر کوئی چیز راس آ سکتی ہے تو ایک ایسی جمہوری تحریک ہے جو پوری قوم کو ایک انجمن سمجھ کر شروع کی جائے اور جس میں توسیع و استحکام کے اسی تناسب کو ملحوظ رکھا جائے جس کو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ملحوظ رکھا تھا۔

یہ تو رہا مسلمانوں میں الگ الگ فرقے اور جماعتیں (پارٹیاں) بنانے کے متعلق۔ جہاں تک پارلیمان میں مختلف پارٹیاں بنانے کا تعلق ہے، مودودی صاحب نے، مجلسِ دستور ساز (۱۹۵۲ء) کے لئے جو "دستوری تجاویز" مرتب اور شائع کی تھیں، ان میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ:-

> مجالسِ قانون ساز میں پارٹیاں بنانا از روئے دستور ممنوع ہونا چاہیئے۔

ہم (معاصر "زندگی"۔ "اسلامی جمہوریہ" اور ان کے دیگر ہم نوا) حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس فارمولا کو آپ نے "پرویزی فارمولا" کہہ کر اُس کا مذاق اڑایا ہے کیا وہ "مودودی فارمولا" نہیں؟ ان دونوں فارمولوں میں البتہ ایک فرق ضرور ہے۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ پرویز صاحب نے جو کچھ ۱۹۳۸ء میں کہا تھا، وہی کچھ وہ ۱۹۷۸ء میں بھی کہہ رہے ہیں۔ اور مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ انہوں نے (جیسا کہ سیاسی کش مکش کے مندرجہ بالا اقتباس میں کہا گیا ہے) ۱۹۳۸ء میں جماعت سازی کو از روئے اسلام ناجائز قرار دیا تھا اور ۱۹۴۱ء میں اپنی الگ جماعت (جماعتِ اسلامی) بنا ڈالی تھی۔ اور اس سلسلہ میں یہ بھی لکھا تھا:-

> ہمارے اس ملک میں سیاسی یا دینی جماعتوں کے الگ الگ وجود کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں جو ایک عام انقباض سا پایا جاتا ہے وہ ایک غلط اندازِ فکر کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے غلطی سے سمجھ رکھا ہے کہ کسی جماعت کا الگ وجود ہی افتراق کی علامت

---

[1] اس کے لئے ایک حدیث بھی وضع کر لی گئی ہے کہ اختلاف اُمتی رحمۃ۔ یعنی حضورؐ نے فرمایا کہ میری اُمت کا اختلاف رحمت ہے۔ یعنی وہ اختلاف جسے خدا عذاب قرار دے رہا ہے، اسے (معاذ اللہ) حضورؐ اپنی اُمت کے لئے رحمت قرار دے رہے ہیں! کیا اس قسم کی بات کو کسی حالت میں بھی حضورؐ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے؟

ہے اور یہ ہر صورت میں اجتماعی مفاد کے لئے خطرے کا باعث ہے۔ یہ نقطۂ نظر درحقیقت یورپ میں اجتماعی جکڑ بندیوں اور یک جماعتی ریاست کے بڑھتے ہوئے رجحانات نے پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی جماعت ملت کے اندر انتشار پیدا کرنے کے لئے قائم کی جاتی ہے تو واقعی خطرہ ہے اور جتنی جلدی ختم ہو جائے اتنا ہی ملت کا فائدہ ہے۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ہر جماعت لازمی طور پر فراق پیدا کرنے کے لئے معرضِ وجود میں نہیں آتی۔ جماعت ایک اجتماعی قوت کا نام ہے۔ اس سے نہایت اچھے مقاصد بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ خصوصاً انسانوں کی تربیت کے لئے تو جماعتوں کا وجود ہمیشہ ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوا ہے۔ (ترجمان القرآن جنوری ۱۹۶۹ء ص۱۱)

یعنی (۱) ۱۹۳۹ء میں جب مودودی صاحب نے ہنوز اپنی جماعت نہیں بنائی تھی تو جماعت سازی اسلام میں ممنوع تھی اور اس کا تصور یورپ سے مستعار لیا گیا تھا۔ اور جب اپنی جماعت بنالی، تو جماعت سازی خدا کی نعمت قرار پا گئی اور جماعتیں مٹانے کا نظریہ یورپ سے مستعار ٹھہرا دیا گیا۔

(۲) ۱۹۳۹ء میں، امت میں جماعت سازی، خواہ کسی قسم کی ہو اور کسی مقصد کے لئے وجود میں لائی جائے، خلافِ اسلام تھی۔ لیکن جماعتِ اسلامی کے وجود میں لانے کے بعد، جماعت اور جماعت میں فرق ہو گیا۔ خلافِ اسلام وہ جماعت قرار پائی جو انتشار پھیلانے کے لئے وجود میں لائی جائے۔

ان سے کوئی پوچھے کہ کیا کوئی جماعت ایسی بھی ہے جو اس کا اقرار کرے کہ اسے مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے وجود میں لایا گیا ہے؟ قرآنِ کریم نے تو مسجدِ ضرار تعمیر کرنے والوں کے متعلق بھی کہا ہے کہ: وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ (۱۰۷/۹) وہ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہماری نیت بالکل ٹھیک ہے اور ہمارا مقصد مفادِ ملت۔ دوسری جگہ جہاں قرآن نے ...... تفرقہ کو مشرکین کا شعار قرار دیا ہے کہا ہے کہ: كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۲/۳۰) ہر پارٹی مطمئن ہوتی ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ لہٰذا وہ کونسی پارٹی ہو سکتی ہے جو کہے کہ وہ باطل پر ہے اور عذابِ خداوندی کی مورد!

(۳) ۱۹۵۲ء میں کہا گیا تھا کہ پارلیمان میں پارٹیاں بنانا ممنوع قرار دیا جائے۔ اس زمانے میں مودودی صاحب کا فیصلہ تھا کہ وہ انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے کیونکہ اس زمانے میں ان کے نزدیک انتخابی طریق یکسر خلافِ اسلام تھا۔ اور جب اپنی جماعت کو انتخابات میں لایا گیا تو فیصلہ کیا کہ:-

صوبائی اور نیشنل اسمبلیوں میں جماعتِ اسلامی کی پارلیمانی پارٹی حسبِ ذیل اصول پر کام کرے گی۔

(جماعت اسلامی کا منشور۔ بحوالہ طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۷۰ء)

یہ ہے پرویزی فارمولے اور "مودودی فارمولے" میں فرق۔ پرویزی فارمولا، قرآن مجید کے ان ابدی قوانین پر مبنی ہے جن کے متعلق خود خدا نے کہا ہے کہ: لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (۱۱۶/۶) قوانینِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

بہر حال، ہم، معاصرِ زندگی۔ اسلامی جمہوریہ اور ان کے دیگر ہمنوا حضرات سے درخواست کریں گے کہ جو آیاتِ قرآنی ہم نے درج کی ہیں وہ بتائیں کہ ان کی رو سے، امتِ مسلمہ میں، مذہبی فرقوں یا سیاسی جماعتوں کو کسی صورت میں بھی جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ وہ چاہیں تو اپنے ساتھ مختلف مذہبی فرقوں اور سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو بھی شامل کر لیں۔ طلوع اسلام کے صفحات ان کے جواب کے لئے حاضر رہیں گے۔ اس سے بھی زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ وہ ہمارے اس تبصرہ کو، اپنے جواب کے ساتھ، خود اپنے ہاں شائع کر دیں تاکہ حقیقت ان کے قارئین کے سامنے بھی آ جائے۔ خدا کرے کہ انہیں اس کی جرأت اور توفیق نصیب ہو۔

باب المراسلات

حدیث کے متعلق میرا مسلک

قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں :-

میں نے آپ کے لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے اور حدیث کے متعلق آپ کے مسلک سے بخوبی واقف ہوں۔ لیکن معترضین کو جواب دینے کے سلسلہ میں ایک وقت پیش آتی ہے۔ آپ نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، وہ آپ کی متعدد کتابوں میں مختلف مقامات پر بکھرا ہوا ہے۔ جواب دینے کے لئے ایک تو آپ کی متعلقہ کتاب کو تلاش کرنا پڑتا ہے اور پھر اس میں متعلقہ مقام کو۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ اپنے مسلک کو نہایت مختصر الفاظ میں طلوعِ اسلام میں شائع کر دیں جسے معترضین کو بآسانی دکھایا جائے۔

جواب

حدیث کے متعلق "نہایت مختصر الفاظ میں" میرا مسلک یہ ہے کہ :-

۱۔ جو حدیث قرآنِ کریم کے خلاف ہو میں اسے صحیح نہیں تسلیم کرتا۔ حضورؐ نبی اکرم کا کوئی ارشاد یا کوئی عمل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا تھا۔ ایسی حدیث کے متعلق میں کہتا ہوں کہ وہ حضورؐ کی حدیث نہیں ہو سکتی۔ اُسے آپ کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ میں حضورؐ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کرتا۔ خلافِ قرآن حدیثوں کے متعلق کہتا یہ ہوں کہ حضورؐ کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں۔ جو حدیثیں قرآنِ کریم سے نہیں ٹکراتیں، میں انہیں صحیح تسلیم کرتا ہوں۔ میری متعدد تصانیف میں اس قسم کی سینکڑوں حدیثیں موجود ہیں۔

۲۔ قرآنِ کریم کے ایسے احکام جن کی جزئیات خود قرآن میں متعین نہیں کی گئیں، اُمت کے مختلف فرقے ان پر جس طرح عمل پیرا ہیں، (مثلاً نماز وغیرہ) ان کے متعلق میں کہتا ہوں کہ کسی فرد یا فرقہ کو حق حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا ردو بدل کرے یا کوئی نیا طریق وضع کرے۔ خود مَیں نے بھی ان میں نہ کسی قسم کا ردو بدل کیا ہے، نہ ہی کوئی نیا طریق وضع کیا ہے۔ اگر کبھی اسلامی مملکت (علیٰ منہاجِ رسالت و خلافتِ راشدہ) قائم ہوگئی تو وحدتِ اُمت کے لئے جس طریق کا وہ فیصلہ کرے اس کا اطلاق سب پر ہونا چاہیئے۔

یہ ہے حدیث کے متعلق میرا مسلک۔ لیکن میں اپنے اس دوست سے کہوں گا کہ جو لوگ ناواقفیت کی وجہ سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اس سے آپ ان کا اطمینان تو کرا سکیں گے لیکن جو لوگ ایک خاص مقصد کے ماتحت میرے خلاف پروپیگنڈہ میں مصروف رہتے

ہیں۔ انہیں آپ اس قسم کی لاکھ تحریریں دکھائیے، وہ آپ سے متفق نہیں ہوں گے۔ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے الزام تراشتے رہتے ہیں۔ ان کا علاج نہ آپ کے پاس ہے، نہ میرے پاس۔ والسلام پرویز

۲۔ کشف المحجوب۔ ذیل کا خط ملاحظہ فرمائیں۔

"مسلمانوں کے تمام فرقوں کا حضرات انبیاء کرامؑ کی عصمت پر اتفاق ہے۔ لیکن بعض اوقات ہمارے اسلاف کی تحریروں میں ایسی چیزیں سامنے آجاتی ہیں جن سے ان کی عصمت داغدار ہوتی نظر آتی ہے۔ اگلے دن حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "کشف المحجوب" کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک عجیب نظر سے گذری اور راقم اپنی کم علمی کی بنا پر اس کی کوئی تاویل نہ کر سکا۔ آپ کو تحریر کر رہا ہوں کہ اگر اس کی کوئی تاویل ہو سکتی ہے تو مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

بائیبل میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے محل کی چھت پر سے اپنے ایک پڑوسی اُوریاہ حتّی کی بیوی کو برہنہ نہاتے دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہو گئے۔ پھر اس کے ساتھ ہم بستر ہوئے۔ اور جب وہ حاملہ ہو گئی تو انہوں نے اس کے شوہر کو بنی عمون کے مقابلے میں جنگ پر بھیج دیا۔ اور فوج کے سالار اعلیٰ کو حکم دیا کہ اسے ایسی جگہ متعین کرے جہاں سے وہ زندہ نہ بچ سکے۔ جب وہ مارا گیا تو داؤد علیہ السلام نے اس کی بیوی سے باقاعدہ شادی کر لی۔ اور شادی کے بعد اس کے بطن سے حضرت سلیمان علیہ السلام پیدا ہوئے[1]" (نعوذ باللہ من ہذا البہتان)

ظاہر ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے ایک معصوم نبی پر بہتان ہے۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر تو کجا اشارہ بھی نہیں ملتا لیکن افسوس ہے کہ ان تفصیلات نے ہماری بعض کمزور روایات میں جگہ پالی ہے۔ اور ہمارے مفسرین ان احادیث کو جانچے بغیر اللہ تعالیٰ کے انبیاءؑ پر اس قسم کے بہتان تسلیم کر لیتے ہیں۔ خود ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر مدینہ کے منافقین اور یہودیوں نے کچھ ایسا ہی جھوٹا الزام لگایا کہ آپؐ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کی بیوی حضرت زینبؓ بنت جحشؓ کو (جو رشتے میں آپ کی سگی پھوپھی زاد بہن تھیں) کو برہنہ حالت میں دیکھ لیا تھا اور ان پر عاشق ہو گئے تھے۔ پھر حضرت زیدؓ سے طلاق دلوائی اور اپنے نکاح میں لے آئے۔ (نعوذ باللہ من ہذا البہتان) قرآن حکیم نے خود اس واقعہ کی واضح الفاظ میں تردید کی ہے۔ اور فرمایا کہ جب نااتفاقی کی بنا پر حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ میں اَن بَن ہو گئی اور حضرت زیدؓ نے طلاق دینے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلعم نے آپ کو ایسا کرنے سے روکا۔ لیکن جب حضرت زیدؓ نے، اس کے باوجود، اپنی بیوی کو طلاق دیدی۔ تو حضورؐ نے ان سے نکاح کر لیا۔

لیکن کشف المحجوب میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت محمد صلعم پر کافروں اور منافقوں کے لگائے ہوئے ان الزامات کو صحیح مان کر درج کر دیا گیا ہے۔ کشف المحجوب کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:۔

تو جب فعل حق مضاف ہو بندہ کی طرف تو بندہ بخود قائم ہوتا ہے۔ اور جب بندہ کا فعل حق کی طرف مضاف ہو تو بندہ بحق قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ داؤد علیہ السلام کی نظر مبارک وہاں پڑی جہاں پڑنی نہ چاہیئے تھی۔ یعنی ایک عورت پر جو اُوریا کی

---

[1] عہد نامہ عتیق۔ سیموئیل ۲۔ باب ۱۲-۱۱

عورت تھی۔ جسے دیکھا وہ ان پر حرام تھی۔ اور جب بندہ بحق قائم ہو گیا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر تو آپ کی بھی پڑی اس طرح زیدؓ کی بیوی پر مگر وہ بیوی زیدؓ پر حرام ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ نظر داؤد علیہ السلام کی تھی وہ محلِ صحو میں تھی اور یہ نظر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی یہ محلِ سُکر میں تھی۔ (کشف المحجوب ترجمہ ابوالحسنات سید محمود احمد قادری۔ شائع کردہ المعارف گنج بخش روڈ لاہور۔ پہلا ایڈیشن ۱۳۹۳ھ۔ صفحہ ۳۵۲) ——— (صحو کے معنی ہوش مندی اور سُکر کے معنی مدہوشی)

کشف المحجوب کے بہت سے اُردو ترجمے ہیں اور ان میں یہ عبارت "صوفیہ کے مختلف مکاتب و مذاہب کے باب" میں فرقہ طیفوریہ کے ذیل میں ہر کتاب میں ملتی ہے۔ ہم نے ابوالحسنات قادری صاحب کا حوالہ اس لئے دیا ہے کہ ان کے عقیدت مندوں کے دعویٰ کے مطابق اسے خود حضرت داتا صاحب کی منظوری حاصل ہے۔ میں یہ عبارت پڑھ کر حیران ہوا تو کسی صاحب نے بتایا کہ میاں محمد طفیل امیر جماعتِ اسلامی پاکستان نے بھی کشف المحجوب کا ترجمہ کیا ہے اور نوٹ بھی لکھے ہیں۔ انہوں نے ضرور اس کی کوئی تشریح فرمائی ہوگی۔ لیکن جب میں نے اس نسخہ کو دیکھا تو اس نے میری پریشانی میں اور اضافہ کر دیا کیونکہ انہوں نے مذکورہ بالا عبارت سمیت بہت سی عبارتیں حذف کر دی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں یہ چیزیں قرآن اور اسلامی تعلیمات کے خلاف نظر آئی ہوں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ جس کتاب کو وہ تعمیرِ سیرت کے لئے مرتب فرما رہے تھے ایسے مقامات کے بارے میں کچھ وضاحت فرما دیتے۔

آپ سے درخواست ہے کہ اس بارے میں میری پریشانی دور فرمائیں۔"

والسلام

دعاگو۔ رفیع اللہ شہاب

طلوعِ اسلام

محترم شہاب صاحب نے، کشف المحجوب کا ایک اقتباس دیکھا اور ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہم نے تصوف کے لٹریچر میں جو کچھ دیکھا ہے، اگر کہیں وہ ان کے سامنے آجائے تو معلوم ان کی کیا حالت ہو! ؎

کیا جانیئے کیا کرتا۔ کیا دیکھتا۔ کیا کہتا ‏ ‏ زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

شہاب صاحب ان "ارشاداتِ عالیہ" کی تاویل کی فرمائش کرتے ہیں۔ انہیں شاید علم نہیں کہ یہ حضرات خدا سے براہِ راست علم حاصل کرکے (جسے کشف و الہام یا باطنی علم سے تعبیر کیا جاتا ہے) اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اس لئے کسی بندۂ بشر کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ انکی کوئی تاویل کر سکے یا ان سے سند کا مطالبہ کر سکے۔ ایسے سوالات کا ان کے ہاں سے جواب یہ ملتا ہے کہ۔ ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی۔

قرآنِ کریم اس لئے آیا تھا کہ نوعِ انسان کو شخصیت پرستی کی پستی سے نکال کر خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے شرفِ مجدِ انسانیت کے مقامِ بلند پر لے جائے۔ حضورؐ نے اپنی عملی زندگی سے ایسا کر کے دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد، مسلمانوں نے قرآن کا دامن بھی چھوڑ دیا اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔ اور دین، مذہب، ایمان، مسلک و مشرب، سب شخصیت پرستی قرار پا گیا۔ چنانچہ اب قوم گلے گلے تک شخصیت پرستی کے دلدل میں غرق ہے۔ چونکہ شخصیت پرستی سے انسان کی عقل و فکر کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور وہ یکسر جذباتی ہو جاتا ہے اس لئے وہ بڑا ذکی الحس (TOUCHY) ہو جاتا ہے اور حقائق کا سامنا کرنے کی اس کی برداشت نہیں رہتی۔

یہ ہے وہ مقام جس پر ہم آج کھڑے ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں، اپنے لٹریچر پر تنقیدی نگاہ ڈالنے اور اسے قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھنے اور اسوۂ حسنہ کے معیار پر جانچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ اس باب میں ایک انگلی اٹھایئے اور پھر دیکھئے کہ آپ بھڑوں کے کتنے چھتوں میں پتھر دے مارتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کے ساتھ یہی تو ہوا ہے ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے ‏ ‏ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

پروفیسر رفیع اللہ شہاب
(گوجرخاں)

سیگریٹ نوشی کے بارے میں

کعبہ شریف کے امام کا فتوے

حج کے موقع پر ہر سال سیگریٹ نوشی کی وجہ سے آگ لگنے کا کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا حادثہ ضرور ظہور پذیر ہو جاتا ہے جس سے بعض اوقات کافی جانی و مالی نقصان ہو جاتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں بھی ایسے نقصانات کی مثالیں کم نہیں۔ ابھی چند دن پہلے کراچی میں اسی عادتِ بد کی وجہ سے ایک اسکول بس میں درجنوں معصوم بچے جھلس کر رہ گئے ؎ چنانچہ اسی بنا پر پچھلے کئی سالوں سے یہ مسئلہ علمائے عرب کی سنجیدہ توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور وہ اس بارے میں شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں اپنے خیالات پیش کر رہے ہیں۔ ان میں بعض حضرات تو سیگریٹ نوشی کو شراب نوشی سے بھی زیادہ سنگین گناہ قرار دیتے ہیں۔

چند سال ادھر کی بات ہے کہ راقم الجزائر جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لئے قاہرہ کے ہوائی اڈے پر ٹھہرا۔ قاہرہ کے ہوائی مستقر پر ایک عظیم کھلی مارکیٹ (سوق الحر) قائم ہے جس میں ہر قسم کا ولایتی مال بغیر کسی کسٹم یا ٹیکس کے دستیاب ہوتا ہے۔ اگرچہ کہنے کو تو وہاں ہر قسم کا مال تھا لیکن زیادہ تر انگریزی شراب کا کاروبار تھا۔ راقم نے وہیں کے ایک عالمِ دین کے سامنے اس وسیع کاروبار پر حیرت کا اظہار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ کی نظر صرف شراب کی طرف کیوں گئی ہے۔ ساتھ والے سٹور میں اسی مقدار میں انگریزی سیگریٹ بھی تو فروخت ہو رہے ہیں اس کا نوٹس کیوں نہیں لیتے جو عملاً ہمارے لئے شراب نوشی سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہو رہے ہیں۔ پھر انہوں نے وسیع پیمانے پر اس سیگریٹ نوشی سے ہونے والے تازہ نقصانات کی طرف اشارہ فرمایا اور اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں یہ رہنمائی فرمائی کہ اسلامی ممالک میں سب سے پہلے سیگریٹ نوشی کا ظہور مصر میں ہوا اور اس وقت کے جیّد علماء نے اسے شراب نوشی کی طرح حرام قرار دیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے ایک فتویٰ کی نقل مہیا کی جس میں یہ تفصیلات کسی حد تک موجود تھیں۔ یہ فتویٰ سلطان عبدالحمید ثانی کے ایک سرکاری قاضی شیخ محمد کامل ابن مصطفٰے نے جاری کیا تھا اور ترکی حکومت نے اسے شائع کرایا تھا۔ فتویٰ کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

الدخان مشروب لا نص فیه للمتقدمین لعدم وجوده فی زنمهم

؎ روزنامہ پاکستان ٹائمز لاہور۔ مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۷۷ء

وانما حدث بعد الالف وكان حدوثه في مصر في زمن اللقاني والاجهوري فافتى اللقاني بتحريمه ونسب ذالك للشيخ سالم السنهوري والتحف في تحريمه وتبعه الخرشي وجماعات وعلل وبتفاصيل منها اضاعة المال بحرقه من غير فائدة۔ [1]

تمباکو نوشی کے بارے میں سلف صالحین سے کچھ منقول نہیں کیونکہ ان کے زمانے میں اس کا وجود نہ تھا۔ اس کا وجود دسویں ہجری کے ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد ہوا۔ جس زمانے میں مصر میں تمباکو نوشی کا رواج ہوا تو اس وقت کے مشہور علماء شیخ اللقانی اور شیخ الاجھوری تھے۔ شیخ اللقانی نے فوراً اس کے حرام ہونے کا فتویٰ صادر فرمادیا۔ اور اس میں شیخ سالم السنہوری کی تائید بھی شامل کی۔ اور اس کی حرمت پر سخت زور دیا۔ ان کے بعد شیخ الخرشی کا زمانہ آیا تو انہوں نے بھی علماء کی ایک جماعت سے مل کر اس کی حرمت کا فتویٰ دیا۔ انہوں نے اس کی حرمت کے بہت سے دلائل دیئے جن میں سے ایک یہ ہے کہ تمباکو نوشی بغیر کسی فائدے کے مال کو جلا کر ضائع کرنا ہے۔

وطن واپس پہنچنے پر راقم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ جب تمباکو نوشی کا ظہور برصغیر ہند و پاک میں ہوا تو یہاں کے علمائے دین کا اس بارے میں کیا ردعمل تھا۔ خوش قسمتی سے تھوڑی سی محنت کے بعد مجھے اس وقت کے ایک مشہور جید عالم کا فتویٰ مل گیا۔ یہ عالم دین برصغیر کے عظیم فقیہہ و مفتی علامہ عبدالحی فرنگی محلی تھے۔ یہ کہنا خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ ابھی تک برصغیر ہند و پاک نے ان جیسا فقیہہ پیدا نہیں کیا۔ فقہ میں اس بلند مرتبے کے باوجود آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب تک اپنا فتویٰ اپنے زمانے کے دوسرے فقہا کو نہ دکھا لیتے، جاری نہیں کرتے تھے۔ آپ نے تمباکو اور سگریٹ کے نشہ آور پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے یعنی جمادی الثانی ۱۲۹۸ھ میں اپنا یہ تاریخی فتویٰ صادر فرمایا:۔

چرٹ پینا مثل حقہ پینے کے ۔۔۔۔ مکروہ تحریمی ہے، بلاریب و بلاشک اور چرٹ پینے میں بسبب مشابہت نصاریٰ زیادہ کراہت ہے۔ واللہ اعلم۔ [2]

بات حج پر سیگریٹ نوشی کی وجہ سے مسلمانوں کے جانی و مالی نقصان سے چلی تھی۔ پچھلے سال علماء عرب نے اس نقصان کا سختی سے نوٹس لیا اور تمباکو کے استعمال کو شرعاً ناجائز قرار دے دیا۔ سعودی عرب کے ڈاکٹر صاحبان نے بھی اس کی تائید کی اور اسے انسانی صحت کے لئے سخت مضر قرار دیا۔ خود سعودی عرب میں سیگریٹ سازی کا کوئی کارخانہ نہیں۔ سب کا سب مال مغربی ممالک سے درآمد ہو کر وہاں پہنچتا ہے۔ سعودی عرب کی حکومت نے ان حضرات کی رائے کا احترام کرتے ہوئے سیگریٹ کی درآمد پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ [3] بدقسمتی سے اس سال پھر حج کے موقعہ پر اسی سیگریٹ نوشی کی وجہ سے صفا کے مقام پر ایک خوفناک آگ بھڑک اٹھی جس سے تین چار بڑی بڑی عمارات

---

[1] الفتاویٰ الکاملۃ فی الحوادث الطرابلسیۃ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵۶۔
[2] مجموعۃ الفتاویٰ مطبوعہ مطبع شوکت اسلام لکھنؤ ۱۳۰۹ھ جلد اوّل صفحہ ۸۳۔
[3] روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ بابت یکم جنوری ۱۹۷۶ء۔

جل کر راکھ ہو گئیں اور کافی مالی نقصان ہوا۔ اور شاید جانی نقصان بھی ہوا ہو۔ چنانچہ اس دفعہ پھر یہ مسئلہ وہاں کے علماء کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کے استعمال کو تو وہ پہلے ہی حرام قرار دے چکے تھے اب انہوں نے اس کی تجارت کو بھی حرام قرار دے دیا جس کی بعض کڑی پابندیوں کے تحت حکومت نے اجازت دے رکھی تھی۔ چنانچہ ۲ دسمبر ۱۹۷۷ء کو خانہ کعبہ کے امام شیخ عبداللہ الخلیفی نے کعبہ شریف میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اعلان کیا:-

فالتجارة بالخمور او المخدرات او التماثيل او الدخان او نحو ذلك مما يحرم الاسلام تناوله او تداوله او الانتفاع به محرمة لا يرضى عنها الاسلام۔ ؎۱

پس شراب، چرس، افیون جیسی نشہ آور چیزیں۔ مجسمے۔ سیگریٹ اور ان جیسی دوسری چیزیں جن کا استعمال شریعت اسلامی حرام قرار دیتی ہے، ان کی تجارت بھی حرام ہے۔ اور اسلام ایسی تجارت کو پسند نہیں کرتا۔

کعبہ شریف میں یہ خطبہ حج کے دنوں میں دیا گیا اور اسے سننے والے ساری دنیا کے دس لاکھ سے زیادہ حجاج کرام تھے۔ مختلف اسلامی ممالک کی مساجد میں کعبہ شریف کے اس خطبے کو عقیدتاً دہرایا جاتا ہے۔ اس لئے اسلامی دنیا میں اس کا خاطر خواہ اثر ہوا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ان میں سے اکثر ایسے لوگ حج کی سعادت حاصل کرتے ہیں جو عربی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے حجاج کرام تھوڑی بہت عربی زبان جانتے ہوتے تو کعبہ شریف میں ارشاد ہونے والے اس خطبے کا ہمارے ہاں بھی بڑا اثر ہوتا اور لاکھوں مسلمان اس عادتِ بد سے نجات پا جاتے۔ اب ہم اپنے علمائے کرام سے ہی یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ سعودی عرب کے علماء کے اس فتویٰ کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچائیں۔

کعبہ شریف کے امام صاحب کے فتویٰ کے بعد اس موضوع پر زیادہ لکھنے کی ضرورت تو نہیں تاہم علمائے کرام نے اس پر جو بحثیں فرمائی ہیں ان میں سے ایک مفید نکتے کی طرف اشارہ کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ جہاں اکثر علماء نے اسے خمر پر قیاس کرتے ہوئے حرام قرار دیا ہے، وہاں بعض حضرات نے اس کی حرمت کے لئے قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے استدلال فرمایا ہے۔

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ. ؎۲

وہ حلال کرتا ہے ان کے لئے طیبات (خوشگوار چیزیں) اور حرام کرتا ہے ان پر خبائث (یعنی گندی اور مضرِ صحت چیزیں)۔

قرآن مجید ایسی تمام اشیاء کو خبیث کے لفظ سے موسوم کرتا ہے جن سے انسان کی صحیح نشوونما میں رکاوٹ ہو اور وہ اس کی صحت بخش بالیدگی میں حائل ہوں۔ اور تمباکو ان اشیاء میں سے ہے کہ جن کے مضرِ صحت اور انسان کی صحیح نشوونما میں رکاوٹ کے بارے میں دنیا کے اکثر ماہرینِ صحت متفق ہیں۔ اسی لئے مجلسِ اقوام متحدہ نے یہ مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے کر تمباکو نوشی کے انسداد کی مختلف النوع اسکیمیں شروع کر رکھی ہیں۔

سیگریٹ نوشی کے بارے میں قدیم اور جدید علمائے اسلام کے فتاویٰ قارئین کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں وہ ان پر عمل کر کے اس عادتِ بد سے خود بھی اور دوسرے مسلمان بھائیوں کو بھی نجات دلا سکتے ہیں۔ ☆

؎۱ اخبار العالم الاسلامی مکۃ المکرمہ۔ بابت ۵ دسمبر ۱۹۷۷ء۔ شمارہ نمبر ۵۵۵۔

؎۲ القرآن الحکیم سورۃ الاعراف۔ آیت ۱۵۷۔

نقد و نظر

متحدہ قومیّت اور اسلام

اس دفعہ ہمیں ایک ایسا پمفلٹ "بغرضِ تبصرہ" موصول ہوا ہے جس کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے۔ شروع ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے کہ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے دہلی میں ایک تقریر کے دوران فرمایا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ چونکہ یہ نظریہ، اسلام کے شجرِ طیب کی جڑوں پر تیر چلانے کے مرادف تھا، علامہ اقبالؒ نے اس کی سخت الفاظ میں تردید کی اور کہا کہ :–

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں، ورنہ ۔ ز دیوبند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است

سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است ۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔ اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

مولانا مدنی (مرحوم) بجائے اس کے کہ اس سے متنبہ ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے، انہوں نے علامہ اقبالؒ کے موقف کی تردید اور اپنے نظریہ کی تائید میں ایک مبسوط بیان شائع کر دیا۔ علامہ اقبالؒ ان دنوں، یوں کہیے گویا مرض الموت کے دورے پڑ رہے تھے لیکن اس مسئلہ کی اہمیت اس قدر تھی کہ انہوں نے اس کے باوجود، مولانا مدنی (مرحوم) کے جواب میں ایک جامع مقالہ شائع فرمایا جس کا عنوان تھا "معرکۂ دین و وطن"۔ وہ مقالہ اس قدر مسکت تھا کہ مولانا مرحوم کو کہنا پڑا کہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسلام میں معیارِ قومیت وطن ہے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ اس زمانے میں قومیں وطن کی نسبت سے بنتی ہیں۔ چونکہ مولانا مرحوم نے اپنی پوزیشن واضح کر دی تھی اس لئے یہ بحث ختم ہو گئی۔ اس کے بعد علامہ اقبالؒ وفات پا گئے۔

لیکن مولانا مدنی (مرحوم) نے علامہ اقبالؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد، ایک ضخیم کتابچہ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کر دیا۔ جس میں کہا کہ علامہ اقبالؒ کا نظریۂ قومیت غلط تھا۔ اسلام میں قومیت کا معیار وطن ہی ہے۔ علامہ اقبالؒ تو اس وقت زندہ نہیں تھے جو اس کا جواب خود لکھتے۔ فکرِ اقبالؒ کا ترجمان، اور قرآنی حقائق کا علمبردار، طلوعِ اسلام جاری تھا۔ اس نے اپنی اشاعت بابت جنوری ۱۹۳۹ء میں اسی عنوان سے ایک جامع مقالہ "راذی" کے قلم سے شائع کیا۔ اس کا جواب، نہ مولانا مدنی (مرحوم) اور نہ ہی ان کے کسی معتقد سے بن پڑا۔ اور اس طرح وہاں یہ بحث ختم ہو گئی۔ طلوعِ اسلام نے اپنے اس مقالہ کا پمفلٹ بھی شائع کیا تھا۔

اس زمانے میں، سید سرور شاہ گیلانی ایک بزرگوار تھے (اور جناب مرحوم ہو چکے ہیں) وہ طلوعِ اسلام میں شائع شدہ اہم مقالات کے پمفلٹ (طلوعِ اسلام کی اجازت بلکہ علم کے بغیر) اپنی طرف سے شائع کر کے، فروخت کیا کرتے

تھے۔ ہم نے ان سے اس پہ باز پرس بھی کی تھی۔ انہوں نے مذکورہ بالا مقالہ (متحدہ قومیت اور اسلام) کو بھی ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا تھا۔ اس کا ٹائیٹل یوں تھا۔

متحدہ قومیت اور اسلام

از مولانا راؔزی ۔ مدیر مجلہ طلوعِ اسلام ۔ دہلیؒ

سید سرور شاہ گیلانی

دفتر اشاعت سیرت ۔ مصری شاہ ۔ لاہور

تشکیلِ پاکستان کے بعد، طلوعِ اسلام، قرآنی نظریۂ قومیت کے بارے میں بتکرار و اصرار لکھتا چلا آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں اس بحث کا ذکر بھی ناگزیر تھا جو ۱۹۳۸ء میں، اس موضوع پہ، علامہ اقبالؒ اور مولانا مدنی (مرحوم) کے مابین ہوئی تھی۔ مولانا مدنی (مرحوم) کے معتقدین کو اس بحث کا تذکرہ ناگوار گزرتا تھا۔ اوائل ۱۹۷۲ء کا ذکر ہے کہ یوسف سلیم چشتی صاحب نے ماہنامہ میثاق میں اس بحث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ جب مولانا مدنی (مرحوم) کے جواب سے علامہ اقبالؒ مطمئن ہو گئے تھے اور اس طرح یہ بحث ختم ہو گئی تھی تو پھر اسے دوبارہ زندہ کرنے سے کیا حاصل ہے! اس پر طلوعِ اسلام نے اپنی اپریل ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں لکھا کہ چشتی صاحب نے علامہ اقبالؒ کی زندگی میں شائع کردہ مولانا مدنی (مرحوم) کے بیان کا تو ذکر کر دیا لیکن ان کی وفات کے چھ ماہ بعد انہوں نے حضرت علامہ کے بیان کی تردید میں جو کتابچہ شائع کیا تھا اور طلوعِ اسلام نے اس کا جو جواب دیا تھا، ان کی طرف اشارہ تک نہیں کیا؛ اس کے بعد طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت جولائی ۱۹۷۵ء میں، وہ مقالہ شائع کر دیا جو جنوری ۱۹۳۹ء میں "متحدہ قومیت اور اسلام۔ از راؔزی" کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس کا جواب کسی سے نہ بن پڑا۔

اب ہمیں مکتبہ حبیبیہ۔ بازار داتا صاحب۔ لاہور، کی طرف سے وہ پمفلٹ بغرض تبصرہ موصول ہوا ہے جسے "سید سرور شاہ گیلانی" نے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا تھا۔ اس پمفلٹ کے آخر میں حسبِ ذیل نوٹ ثبت ہے۔

نوٹ:۔ مولوی حسین احمد دیوبندی صاحب کا رسالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" جامعہ مدنیہ لاہور کی طرف سے طبع ہو کر ملک میں تقسیم ہو رہا ہے۔ اس کے زہریلے اثرات کو دور کرنے کے لئے اس کا رد "متحدہ قومیت اور اسلام" از مولانا راؔزی کا فوٹو دوبارہ (فروری ۱۹۷۸ء میں) شائع کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ناظم مکتبہ حبیبیہ۔ بازار داتا صاحب۔ لاہور

ہم حیران ہیں کہ ہم خود اپنے ہی مقالہ پہ کیا تبصرہ کریں؛ ہم نے مکتبہ حبیبیہ والوں سے کہا ہے کہ جب اس پمفلٹ پہ "مدیر طلوعِ اسلام" لکھا تھا۔ اور یہ آپ کو معلوم ہوگا کہ طلوعِ اسلام، پاکستان میں ۱۹۴۸ء سے (اور خود لاہور سے ۱۹۵۵ء سے) باقاعدہ شائع ہو رہا ہے تو کیا آپ کا (قانونی ایک طرف) اخلاقی اور صحافتی فریضہ نہیں تھا کہ اسے شائع کرنے سے پہلے طلوعِ اسلام سے اجازت لے لیتے! (ان سطور کی تسوید کے وقت تک ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا)۔

ط "راؔزی" نہ مولانا تھے اور نہ ہی مدیر مجلہ طلوعِ اسلام۔ وہ صرف مقالہ نگار تھے۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ ایک اور بات ! جب یہ مقالہ طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تو ہم نے اس پرچہ کی کاپیاں مختلف اخبارات کو برائے تبصرہ بھیجی تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے اس پر تبصرہ کرنا تو ایک طرف اس کی رسید تک نہ دی۔ اب جو وہی مقالہ، مکتبہ حبیبیہ کی طرف سے شائع ہوا ہے، تو اس پر نہ صرف نہایت عمدہ تبصرے شائع ہوئے ہیں، بلکہ روزنامہ نوائے وقت نے پورے کا پورا مقالہ آدھ آدھ صفحہ پر مشتمل آٹھ نو قسطوں میں شائع کیا ہے۔

اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ مقالہ نگار" رازی صاحب" وہی تھے جنہیں پرویز صاحب کہا جاتا ہے، تو معلوم انہیں اپنے اس" گناہ کے کفارہ" کے لئے کیا کچھ کرنا پڑے! بہرحال، ہمیں اس کی خوشی ہے کہ کسی بہانے سہی، حق بات کی اشاعت تو ہوئی۔ غرض اندر میاں سلامت او ست

۲۔ نام کتاب

(LAND LORD AND PEASANT IN EARLY -- ISLAM--)

(ابتدائے اسلام میں مالک زمین اور مزارع)

از ڈاکٹر ضیاء الحق صاحب۔ شائع کردہ۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی۔ اسلام آباد۔ ضخامت ۴۱۰ صفحات۔ قیمت مجلد ۶۵/- روپے ——— تبصرہ نگار۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں اسلامی معاشیات کے دو اہم مسائل، یعنی ملکیتِ زمین اور معاملہ بٹائی پر بحث کی گئی ہے۔ یہ دونوں مسائل اگرچہ سادہ ہیں اور ان کے شرعی احکامات بڑے واضح اور دوٹوک، لیکن خلافتِ اسلامیہ کے ملوکیت میں بدل جانے کی وجہ سے ان میں الجھاؤ پیدا ہو گئے۔ اور پھر بعد کے ہر دور میں یہ مسائل مزید الجھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ان کا واضح کرنا مشکل ہو گیا۔ اس الجھاؤ کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان صاف و سادہ مسائل کو قرآن حکیم کی روشنی میں حل کرنے کے بجائے انہیں مختلف زمانوں کے معاشرتی رواجوں کے مطابق حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ اس وقت عملی صورت یوں ہے کہ کچھ علماء تو زمین کی بٹائی کو جائز اور حلال قرار دیتے ہیں، اور بعض اسے مطلقاً حرام ٹھہراتے ہیں۔ اس اہم مسئلہ کا تعلق کروڑوں مسلمانوں کی زندگی سے ہے اس لئے لوگ حیران ہیں کہ اتنا اہم معاملہ کس طرح بیک وقت حلال بھی ہو سکتا ہے اور حرام بھی۔ غالباً لوگوں کی اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد نے اس اہم موضوع کی علمی تحقیق کا بیڑا اٹھایا اور ایک فاضل اسکالر ڈاکٹر ضیاء الحق صاحب کے سپرد یہ کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی میں قابل اساتذہ کی نگرانی میں اس اہم کام کو بڑی محنت سے سرانجام دیا۔ کتاب میں اگرچہ ہر دو مسائل پر مفصل بحث ہے لیکن اگر ان میں سے ایک مسئلہ کی شرعی حیثیت واضح ہو جائے تو دوسرے کی حیثیت خود بخود متعین ہو جاتی ہے اس لئے اختصار کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم صرف بٹائی کے معاملے کے بارے میں فاضل محقق کی تحقیق پر طائرانہ نظر ڈالیں گے۔

بٹائی کے بارے میں فاضل مصنف نے بلاشبہ تمام احادیث جمع کر دی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ بعض فقہاء، جن میں حضرت امام ابوحنیفہ رح بھی شامل ہیں، انہی احادیث سے بٹائی کی حرمت ثابت کرتے ہیں۔ اور بعض فقہا اختلافی احادیث سے اس کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ فاضل مصنف اس کا حل یوں پیش کرتے ہیں کہ ان احادیث پر بٹائی کے مسئلے کی تاریخی

حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے بحث کی جائے تو معاملہ صاف ہو سکتا ہے (صفحہ ۲۸) کیونکہ یہ زمانے کے تقاضے ہی تھے جنہوں نے فقہاء کو لچکدار رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ (صفحہ ۵۲)۔ جہاں تک ان کی بحث کے نتیجے کا تعلق ہے وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے۔ وہ کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ایسے تمام معاملات شریعتِ اسلامیہ میں نہ صرف یہ کہ حرام ہیں بلکہ اس کی بنیادی تعلیمات پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ (صفحہ ۲۶۰) لیکن کتاب میں بحث کے دوران کچھ ایسی تفصیلات پیش کر جاتے ہیں جن سے یہ مسئلہ سلجھنے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ الجھ جاتا ہے۔ مثلاً حنفی فقہ کے بانی، حضرت امام ابوحنیفہؒ بٹائی کے معاملے کو حرام قطعی قرار دیتے ہیں تو ان کے مسلک کے بارے میں فاضل مصنف یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ ایک تصوراتی قسم کا مسلک تھا۔ یہاں تک کہ خود آپ کے شاگردوں نے بھی اسے قبول نہ کیا۔ (صفحہ ۷)۔ یہی نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں امام صاحب کے اس تصوراتی مسلک پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بٹائی کی حرمت کا فتویٰ دیتے وقت انہوں نے معاشرتی رواجات کی صحیح اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا تھا۔ (صفحہ ۲۵۸)۔

اس کے برعکس وہ امام صاحب کے ایک شاگرد قاضی ابویوسفؒ کے (بٹائی کے) جواز کے فتویٰ کو حقیقت پسندانہ قرار دیتے ہیں۔ (صفحہ ۷، ۲۲۵) خیال رہے کہ قاضی ابویوسفؒ نے بٹائی کے جواز کے لئے احادیث سے استدلال کرنے کی بجائے اسے مضاربت کے اصول پر قیاس کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ یجوز علی اصول المضاربۃ لحاجۃ الناس الیہا۔ مضاربت یہ ہے کہ سرمایہ ایک فریق کا ہو، اور محنت دوسرے فریق کی۔ نفع کی صورت میں دونوں فریق نفع کو بانٹ لیتے ہیں لیکن اگر اس کاروبار میں نقصان ہو تو اسے سرمایہ دار کے ذمے ڈالا جاتا ہے اور محنت کرنے والے فریق کو اوسط حساب سے اخراجاتِ زندگی ادا کئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بٹائی کے معاملے کو مضاربت پر کسی طور بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر بٹائی کے معاملے میں فصل تباہ ہو جائے تو سرمایہ دار کے سرمائے (زمین) کا تو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ لیکن محنت کرنے والے فریق یعنی مزارع کی نہ صرف یہ کہ سال بھر کی محنت ضائع جاتی ہے بلکہ بیج، آلات اور جانوروں کی شکل میں اس نے جو سرمایہ لگایا ہوتا ہے وہ بھی برباد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابنِ حزمؒ اور بہت سے دوسرے فقہاء نے یہ فیصلہ دیا کہ بٹائی کے معاملے کو مضاربت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ (صفحہ ۷۸)۔ خود فاضل مصنف کا اپنا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس کے باوجود وہ قاضی ابویوسفؒ کے مسلک کو حقیقت پسندانہ قرار دیتے ہیں!

مضاربت کے بارے میں ایک اور حقیقت بھی فاضل مصنف کے سامنے نہیں آئی۔ وہ یہ کہ یہ سرے سے اسلامی معاملہ ہی شمار نہیں ہوتا۔ یہ زمانہ جاہلیت کے کاروباری معاملات میں سے ایک معاملہ تھا۔ اسی لئے امام ابنِ حزمؒ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

کل ابواب الفقہ فیہا اصل من الکتاب والسنۃ حاشا القراض فما وجدنا لہ اصلا۔ (نیل الاوطار۔ جلد پنجم۔ صفحہ ۲۸۲)

فقہ کے تمام ابواب کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے، سوائے مضاربت کے باب کے جس کی ہمیں کوئی شرعی بنیاد نہیں مل سکی۔

تبصرے کے ابتداء میں ہم نے کہا تھا کہ بٹائی کی شرعی حیثیت کا معاملہ سادہ اور واضح ہے۔ ملوکیت نے اسے الجھا دیا تھا۔ اب بھی اگر ہم قرآنِ کریم سے رہنمائی حاصل کریں تو یہ پہلے کی طرح سادہ اور واضح ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے کئی مقامات کی بحث خود اس بات

کا تقاضا کرتی تھی کہ اس بارے میں قرآنِ حکیم کی رہنمائی ... حاصل کی جاتی ۔ مثلاً صفحہ ۱۶۱ پر بٹائی کے معاملے کو وہ سود کے مشابہ قرار دیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلعم نے اسے خالص سودی معاملہ قرار دیا ہے ۔ فاضل مصنف نے رسول اللہ صلعم کے یہ ارشادات صفحہ ۲۱ اور ۲۶۴ پر نقل تو کئے ہیں لیکن انہیں مناسب اہمیت نہیں دی ۔ حالانکہ سود شریعتِ اسلامی میں سب سے بڑا جرم ہے ۔ یہاں تک کہ قرآنِ کریم نے اسے اللہ اور رسولؐ کے خلاف بغاوت قرار دیا ہے ۔ جب اللہ کا رسول صلعم قرآن کریم کی روشنی میں بٹائی کے معاملے کو سود قرار دے دیں تو پھر معاشرتی رواجوں کی روشنی میں فقہاء کے جواز کے فتاویٰ کیا حیثیت رکھتے ہیں ! کیا اللہ اور رسولؐ کے خلاف بغاوت معاشرتی رواجوں کی روشنی میں جائز قرار پا سکتی ہے ! ایک سادہ مسلمان کے لئے تو حضور صلعم کا یہ واضح ارشاد ہی کافی ہے کہ یہ معاملہ سود کی تعریف میں آتا ہے ۔ تاہم فاضل مصنف اگر چاہتے تو جدید علوم کی روشنی میں بھی اس پر بحث کر سکتے تھے ۔ وہ سود کی شرعی تعریف کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتے کہ آیا یہ معاملہ واقعی سود کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں ۔ تاہم اس سلسلے میں بھی انہیں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں تھی ۔ خود جدید مغربی ماہرینِ معاشیات اسے سود ہی شمار کرتے ہیں ۔ موجودہ دور کا مشہور ماہرِ معاشیات لارڈ کینز سود کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتا ہے ۔ "وہ اعلیٰ معاوضہ جو قدیم زمانے میں اراضی پر اور عہدِ حاضر میں سرمائے پر وصول کیا جاتا ہے ۔" (بحوالہ اسلام اور سود مطبوعہ لاہور از انور اقبال قریشی صفحہ ۸۹) آئندہ ایڈیشن میں اگر فاضل مصنف اس نقطۂ نظر سے بحث کو دوبارہ ترتیب دیں تو معاملہ زیادہ واضح ہو کر سامنے آجائے گا ۔

طلوعِ اسلام

ہم نے اس کتاب کو نہیں دیکھا لیکن پروفیسر شہاب صاحب کے تبصرہ کی روشنی میں اتنا اضافہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی تحقیق اگر تاریخی نقطۂ نگاہ سے کی جائے اور اس کے ماحصل کو محض تاریخی حیثیت دی جائے تو یہ مفید ہو سکتی ہے ۔ اسے دینی حیثیت دینا غلط ہوگا ۔ انسانوں کے مہیا کردہ مواد سے ، انسانوں کے اخذ کردہ نتائج دینی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے ۔ دینی حیثیت ارشاداتِ خداوندی ہی کی ہو سکتی ہے ۔ زمین کی ملکیت اور ربوٰ کا تعلق مہاتِ اصول سے ہے ۔ اور قرآنِ مجید نے انہیں واضح طور پر بیان کیا ہے ——— اگر وہ اس قسم کے معاملات کو بھی وضاحت سے بیان نہیں کرے گا تو انسانی زندگی کے لئے ضابطۂ ہدایت کس طرح قرار پا سکے گا ؛ قرآنِ کریم کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی ، اور محض سرمایہ پر معاوضہ ، خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو ، ربوٰ ہے اور حرام قطعی ۔ بات بالکل صاف تھی جسے ہمارے دورِ ملوکیت کی مفاد پرستوں نے چیستاں بنا کر رکھ دیا ہے ۔ جب تک ہم ان چیستانوں کو اپنے ذہن سے الگ کر کے دینی معاملات پر غور نہیں کرتے ، کوئی بات بھی واضح نہیں ہو سکتی ۔

بقول اقبالؒ ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ،
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے !

قائدِ اعظمؒ

متوسط سائز کے قریب سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب مجموعہ ہے آغا حسین ہمدانی صاحب کے ان پانچ مقالات کا جو صد سالہ جشنِ پیدائش قائدِ اعظمؒ کے سال (۱۹۷۶ء) کے دوران مختلف جرائد میں شائع ہوئے تھے۔ مقالہ اوّل میں قائدِ اعظمؒ کے حالاتِ زندگی مختصر طور پہ بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے مقالہ کا موضوع ہے۔ "قائدِ اعظمؒ اور تحریک آزادیٔ کشمیر" مقالہ کے مندرجات' عنوان سے ظاہر ہیں۔ اور اختصار کے باوجود معلومات افزا ہیں۔ تیسرے مقالہ کا عنوان ہے۔ "دو عظیم بہن بھائی" یہ مقالہ درحقیقت حاصل تصنیف ہے۔ اس میں "قائدِ اعظمؒ کی مایۂ ناز ہمشیرہ محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کی روایات سے' قائدِ اعظمؒ سے متعلق بعض ایسے واقعات درج ہیں' جو دلآویز بھی ہیں اور معلومات افزا بھی۔ کہا یہ گیا ہے کہ مرحومہ نے "جی الانہ صاحب کی مدد سے، قائدِ اعظمؒ کی سوانح عمری بنام "مائی برادر" لکھنی شروع کی تھی جو نامعلوم حالات کی بنا پہ نامکمل رہی اور اب دستاویزاتِ قائدِ اعظمؒ، وزارتِ تعلیم میں محفوظ ہے۔" مقالہ میں درج کردہ بیشتر واقعات اسی دستاویز سے ماخوذ ہیں۔ جب یہ مقالہ ماہنامہ فکر و نظر میں شائع ہوا تھا تو ہم نے اس سے ماخوذ بعض واقعات طلوعِ اسلام میں بھی شائع کئے تھے۔

چوتھے مقالہ کا موضوع ہے۔ "علامہ اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ کی نظر میں"۔ قائدِ اعظمؒ نے مختلف تقریبات پہ علامہ اقبالؒ سے متعلق جن گرانقدر خیالات کا اظہار کیا تھا، اس مقالہ میں انہیں یکجا کر دیا گیا' اور اس طرح ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک سلکِ حریری میں پرو دیا گیا ہے۔ مؤلف کی یہ کوشش مفید بھی ہے اور روح پرور بھی۔ آخری مقالہ میں "قائدِ اعظمؒ کے آخری ایام" کے جستہ جستہ لمحات درج ہیں' یہ سرگزشت مختلف مقامات پہ اس سے پہلے بھی سامنے آ چکی ہے۔ لیکن، وہ آخری (اکھڑے اکھڑے سے) الفاظ جو سکراتِ موت کے عالم میں' قائدِ اعظمؒ کے لبوں پر تھے' اور جنہیں محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کی روایت سے بیان کیا گیا ہے، کم از کم ہمارے علم میں، اس سے پہلے نہیں آئے تھے۔ وہ الفاظ تھے۔ــــ "کشمیر...... انہیں دیں...... حق...... فیصلہ کرنا ہے...... آئین میں مکمل کروں گا...... جلد...... مہاجرین...... انہیں...... دیں تمام امداد...... پاکستان......" اور آخری سانس میں لا الٰہ...... اللہ...... محمد...... رسول...... اللہ......

مقالہ کے آخر میں' تین ضمیمہ جات ہیں جن میں خطبۂ صدارت اجلاس میثاق لکھنؤ۔ خطبۂ صدارت اجلاس قرارداد پاکستان۔ اور خطاب اوّل ملتِ پاکستان' یعنی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر' شامل ہیں۔ کتاب سفید کاغذ پہ چھپی ہے اور "نوید نو رسٹی صدر روڈ، راولپنڈی" نے شائع کی ہے۔ قیمت دس روپے ہے جو ہمارے نزدیک ایسی مختصر اور بلا جلد کتاب کی، زیادہ ہے۔

قائدِ اعظمؒ ـــــ اور ـــــ اقبالؒ

(۲۳ مارچ اور ۲۱ اپریل کی یاد میں)

یہ حقیقت ہے، جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمانانِ ہند کی تقدیر بدلنے کا بنیادی سبب جناحؒ اور اقبالؒ کا قِران السعدین ہے۔ جناحؒ اور اقبالؒ کی ابتدائی زندگی (بلکہ یوں سمجھئے کہ بیسویں صدی کے چوتھے عشرہ سے پہلے کی زندگی) ایک دوسرے کی ضد تھی۔ ان متضاد عناصر میں اس قدر اتفاق ہی نہیں، ائتلاف کس طرح پیدا ہو گیا، یہ وہ مقام ہے جہاں چشمِ منطق کے سامنے حیرت کے سوا کچھ نہیں آتا۔ مسٹر جناحؒ، یوں کہیئے کہ "پیدائشی نیشنلسٹ" انہوں نے ۱۹۲۵ء میں لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا کہ "میں اول بھی نیشنلسٹ ہوں ... دوم بھی نیشنلسٹ اور آخر بھی نیشنلسٹ"۔ اور علامہ اقبالؒ کے نزدیک وطنیت (یا نیشنلزم) کفر اور شرک تھی۔ وہ اسے عصرِ حاضر کے تازہ خداؤں میں سب سے بڑا بت قرار دیتے تھے۔ لہٰذا، ان دونوں میں ملاپ کی کیا صورت ہو سکتی تھی؟ عملی سیاست میں اختلاف کا یہ عالم کہ علامہ اقبالؒ دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱ء) میں مسلم ڈیلی گیشن کے ممبر کی حیثیت سے لندن تشریف لے گئے تو فیڈرل کمیٹی کے ایک فیصلہ کے خلاف، جو مسٹر جناحؒ اور سر محمد شفیع کی تائید سے عمل میں آیا تھا احتجاج کے طور پر آپ نے وفد سے علیحدگی اختیار کر لی اور واپس وطن تشریف لے آئے۔ لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

مسٹر جناحؒ، ہندو مسلم اتحاد کے لئے مسلسل جہاد کرتے رہے۔ اس باب میں ان کی سرگرمیوں کا یہ عالم تھا کہ میثاقِ لکھنؤ پر، مسز سروجنی نیڈو نے انہیں "ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر" کے خطاب سے نوازا، لیکن ایک عمر کی تگ و دو کے بعد ان پر یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے اور ان کی ساری کوششیں بیکار ہیں۔ وہ اس تلخ تجربہ سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ سیاست ہی نہیں، وطن تک چھوڑ کر لندن میں رہائش اختیار کر لی۔

لیکن دیدہ ورِ اقبالؒ کی نگاہِ بصیرت کی داد دیجئے کہ اس قدر بعد اور افتراق کے باوجود، وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اگر کوئی شخص صحیح راہ نمائی کر سکتا ہے تو وہ صرف جناحؒ ہے۔ اپنے اس فیصلہ کے بعد انہوں نے مسٹر جناحؒ کو (CONVERT) کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ جو لوگ مسٹر جناحؒ کے مزاج اور افتادِ طبیعت سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہیں (CONVERT) کرنا ـــــ اور وہ بھی ایسے مسئلہ میں جس کے خمیر سے ان کے آب و گل کی تعمیر ہوئی تھی، کس قدر امرِ محال تھا۔ علامہ اقبالؒ ان حقائق سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں اپنے موقف کی صداقت اور اپنے دلائل کی محکمیت پر اس قدر پختہ یقین تھا کہ وہ اس مقصد

کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے تا آنکہ مسٹر جناحؒ اُن سے متفق ہو گئے۔ یہ حقیقت شاید ایک راز ہی رہتی اگر ہیکٹر بولیتھو (HECTOR BOLITHO) اپنی کتاب (JINNAH) میں اس کی نقاب کشائی نہ کرتا۔ وہ اس میں لکھتا ہے:-

> مسٹر جناحؒ نے لندن میں، سر محمد اقبالؒ سے بہت سی ملاقاتیں کیں، وہ بڑے اچھے دوست تھے۔ مسٹر جناحؒ اگرچہ (اپنے سابقہ سیاسی مسلک کے متعلق) اب کسی غلط فہمی میں نہیں تھے، بایں ہمہ وہ اقبالؒ کے دلائل سے (اتنی جلدی) متفق نہیں ہوئے۔ اس میں قریب دس[1] سال کا عرصہ لگ گیا کہ مسٹر جناحؒ نے اس کا اعتراف کیا کہ ہندوستان کی سیاست کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اقبالؒ کا نقطۂ نظر صحیح ہے۔ (صفحہ ۹)

اس تبدیلیٔ فکر و نظر کے بعد جب مسٹر جناحؒ واپس وطن آئے، تو ہیکٹر بولیتھو نے ان کی اس وقت کی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

> مسٹر جناحؒ اپنے بمبئی کے مکان میں بالکل تنہا تھے۔ ان کے پاس کوئی ذاتی سٹاف نہیں تھا۔ حتیٰ کہ کوئی سیکرٹری بھی نہیں جو ان کے خطوط کی نقلیں رکھ سکتا اور ان کے کاغذات کو باقاعدہ فائل کئے جاتا۔ اس بے قاعدگی کے باوجود، ان کے دراز میں خطوط کا ایک ایسا بنڈل تھا جس سے وہ تسکینِ خاطر حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ وہ خطوط تھے جو (علامہ اقبالؒ نے) انہیں انگلستان میں ۱۹۳۲ء میں کی گئی ملاقات کے بعد لکھے تھے۔ اقبالؒ نے، ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں لکھا تھا کہ "ہندی مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل یہی ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، انہیں باقی ماندہ ملک سے الگ کر کے، ان میں آزاد مملکت یا مملکتیں قائم کر دی جائیں۔ کیا آپ کا خیال نہیں کہ اس کے لئے مناسب وقت آپہنچا ہے؟ (صفحہ ۱۱۳)

آپ سوچئے کہ علامہ اقبالؒ کے خطوط کا وہ بنڈل جس کی طرف بولیتھو نے اشارہ کیا ہے، ملت کے لئے کس قدر متاعِ گراں بہا تھا۔ لیکن وائے برحالِ ما کہ ان خطوط کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا۔ نہ ہی اُن خطوط کا جو قائداعظمؒ نے جواب میں لکھے تھے۔ "اقبالؒ کے خطوط جناحؒ کے نام" کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں مئی ۱۹۳۶ء تا نومبر ۱۹۳۷ء کے خطوط ہیں۔ مسٹر بولیتھو جن خطوط کا ذکر کرتا ہے وہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو، قائداعظمؒ کے نام جو خط لکھا، اس نے ہماری تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ انہوں نے اس خط میں لکھا تھا:-

> میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گذرتا ہوگا۔ (میرے اس تکرار اور اصرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جن کے ساتھ ملت کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔

ان کوائف سے آپ سوچئے کہ ملتِ اسلامیہ کے آسمان پر، ان دو درخشندہ ستاروں کا "قرانِ السعدین" کیسے ہوا تھا اور اس نے کس طرح اس ملت کی تقدیر بدل دی؟

---

[1] ہم سمجھتے ہیں کہ اتنا زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے ایک سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ اور مختلف صوبوں میں پراونشل پارلیمنٹری بورڈ بنائے تھے۔ پنجاب میں ایک بورڈ علامہ اقبالؒ کی صدارت میں متشکل ہوا۔ اسی بورڈ کی طرف سے مئی ۱۹۳۶ء کو مسلمانانِ پنجاب کے نام ایک اپیل، مسلم لیگ اور مسٹر جناحؒ کی حمایت میں، علامہ اقبالؒ اور دیگر مسلم راہ نماؤں کے دستخطوں سے شائع ہوئی۔ اپیل کے سرنامہ علامہ کا یہ شعر درج تھا:

گیا دورِ سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا

تمہیدی جملوں کے بعد اس اپیل میں کہا گیا تھا:۔

بطلِ جلیل، مسٹر محمد علی جناحؒ ان قابلِ فخر مسلم راہ نماؤں میں سے ہیں جن کی سیاسی دانش ہمیشہ مسلمانوں کے لئے صبر آزما دقتوں میں مشعلِ راہ کا کام دیتی رہی ہے۔ جس خلوص اور عزیمت سے انہوں نے مسلمانانِ ہند کی تمام اہم اور نازک موقعوں پر خدمت کی ہے اس کے لئے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کے سر، عقیدت و احترام سے جھکے رہیں گے۔

(گفتارِ اقبالؒ۔ صفحہ ۲۰۳)

مارچ ۱۹۴۰ء میں بزمِ اقبالؒ کے سالانہ اجلاس میں، سر عبدالقادر (مرحوم) نے علامہ اقبالؒ کے ایک خط کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جو انہوں نے ایک دوست کے خط کے جواب میں بسترِ علالت سے ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا۔ اس دوست نے علامہ کی صحت کی دعا کی تھی۔ علامہ نے لکھا تھا:۔

میرا وقت پورا ہو چکا ہے اور میرا پیغام ملت تک مکمل صورت میں پہنچ چکا ہے۔ میرے لئے صحت کی دعا مانگنے کے بجائے آپ قائداعظم محمد علی جناحؒ اور کمال اتاترک کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کیجئے کہ انہیں ابھی اپنا مشن پورا کرنا ہے۔

(نوائے وقت۔ مورخہ ۹ مارچ ۱۹۷۷ء)

۱۹۳۵ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو، علامہ اقبالؒ سے ملنے کے لئے آئے تو میاں افتخار الدین (مرحوم) بھی ان کے ساتھ تھے۔ مسلم لیگ کی تنظیم اور مسلمانانِ ہند ...... کی قیادت کے موضوع پر گفتگو کے دوران، میاں افتخار الدین نے حضرت علامہ سے کہا کہ لیگ کی قیادت آپ خود اپنے ہاتھ میں کیوں نہیں لے لیتے؛ اس پر انہوں نے ایک ثانیہ کے توقف کے بغیر فرمایا کہ "میں مسٹر جناحؒ کے ایک سپاہی کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہوں"۔

یہ تھی علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں قائداعظمؒ کی قدر و منزلت۔ اب قائداعظمؒ کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ ان کے دل میں علامہ اقبالؒ کا کس قدر احترام تھا اور وہ انہیں کیا سمجھتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی وفات پر، قائداعظمؒ نے انہیں اپنا رفیق، راہ نما، اور مفکر کہہ کر یاد کیا اور فرمایا کہ "تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں جو تاریک ترین دور تھا وہ اس میں ایک چٹان کی طرح بجود خزیدہ، محکم کھڑے رہے اور ان کے پائے ثبات میں ایک لمحہ کے لئے بھی لغزش نہیں آئی"۔ اسی سال (دسمبر ۱۹۳۸ء میں) آل انڈیا مسلم لیگ کا مشہور اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا تو انہوں نے پھر علامہ اقبالؒ کی خدمت میں ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

علامہ اقبالؒ کی وفات مسلمانانِ ہند کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مسلم لیگ ان کی وفات پر پہلے ہی اظہارِ تعزیت کر چکی ہے۔ وہ میرے ذاتی دوست تھے اور ان کا شمار دنیا کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ رہے گا۔ ان کی بلند پایہ شاعری، مسلمانانِ ہند کی تمناؤں اور آرزوؤں کی ترجمان ہے۔

وہ ہمارے اور ہماری آنے والی نسلوں کے دلوں میں تازہ روح پھونکتی رہے گی۔

(تقاریر محمد علی جناحؒ ۔ صفحہ ۷۶)

انہوں نے، سنہ ۱۹۴۰ء میں یومِ اقبالؒ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے، علامہ اقبالؒ کو ان الفاظ میں یاد فرمایا:- [۲]

اقبالؒ میرا بڑا دوست تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ ابتدا میں ایک علمی سی جماعت تھی۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں ہم میں سے بعض نے خیال کیا کہ اس جماعت کو صحیح یا دنیاوی جماعت میں بدل دیا جائے۔ جب میں اپریل سنہ ۱۹۳۶ء میں پنجاب آیا تو پہلا شخص جسے میں ملا وہ اقبالؒ تھا۔ میں نے اپنے خیالات ان کے سامنے پیش کئے۔ انہوں نے فوراً لبیک کہا اور اس وقت سے تا دمِ مرگ وہ میرے ساتھ مضبوط چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ علامہ اقبالؒ عظیم انسان اور بلاشبہ بہت بڑے فلاسفر تھے۔ جب تک مشرقی زبانیں موجود رہیں گی اقبالؒ کا کلام زندہ رہے گا۔ وہ خود ہندوستانی تھے۔ لیکن دنیا میں شاعرِ اعظم کی حیثیت سے متعارف تھے۔ انہوں نے مسلم سیاسی شعور پیدا کرنے میں گراں بہا خدمات انجام دیں۔ میں اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ میں علی گڑھ میں ریل کا سفر کر رہا تھا۔ راستہ میں ایک چھوٹے سے سٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو سینکڑوں کی تعداد میں دیہاتی جمع ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ ان کے اجتماع کا مقصد کیا ہے کہ دفعتاً ان سب نے اقبالؒ کا یہ ترانہ پڑھنا شروع کر دیا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

شعرا اقوام میں زندگی پیدا کرتے ہیں۔ ملٹن، شیکسپیئر، بائرن وغیرہ نے قوم کی بے بہا خدمت کی ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ اقبالؒ نے سب سے زیادہ خدمت کی ہے۔ کارلائل نے شیکسپیئر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا ہے کہ اسے جب شیکسپیئر اور دولتِ برطانیہ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے کہا کہ "میں شیکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دوں گا"۔ گو میرے پاس سلطنت نہیں لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبالؒ اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبالؒ کو منتخب کروں گا۔" [۲]

قائدِ اعظمؒ نے سنہ ۱۹۴۱ء کے یومِ اقبالؒ، کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

اگر میں اس تقریب (یومِ اقبالؒ) میں شامل نہ ہوتا تو اپنی ذات کے ساتھ بڑی ناانصافی کرتا۔ میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جلسہ میں شریک ہو کر اقبالؒ کو عقیدت کے پھول پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ اقبالؒ کی ادبی شہرت عالمگیر ہے۔ وہ مشرق کے بہت بڑے بلند پایہ شاعر اور مفکرِ اعظم تھے۔ مرحوم دورِ حاضر میں اسلام کی تاریخ تھے۔ اس زمانہ میں اقبالؒ سے بہتر اسلام کو کسی شخص نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس کا فخر ہے کہ میں نے اس کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے۔ میں نے اس سے زیادہ وفادار اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔ جس بات کو وہ صحیح خیال کرتے۔ یقیناً وہ صحیح ہوتی تھی اور وہ اس بات پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتے تھے۔ [۳]

انہوں نے سنہ ۱۹۴۴ء میں یومِ اقبالؒ کے موقعہ پر حضرتِ علامہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:-

---

[۱] ان اقتباسات کی تدوین میں آغا حسین ہمدانی صاحب کی کتاب "قائدِ اعظمؒ" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

[۲] "انقلاب" ۲۹ / مارچ سنہ ۱۹۴۰ء۔

[۳] ہفتہ وار حمایتِ اسلام۔ ۴ / مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

میں اس دن جبکہ ہمارے عظیم ملّی شاعر اور مفکر، اقبالؒ کا یوم منایا جا رہا ہے، خلوصِ قلب سے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کی روح کو بے پایاں رحمت سے ابدی سکون عطا فرمائے۔

(بحوالہ کتاب ۔ قائدِ اعظمؒ ۔ صـ۵۴)

انہوں نے، یومِ اقبال کی تقریب (منعقدہ لاہور، دسمبر ۱۹۴۴ء) پر حسبِ ذیل پیغام ارزانی فرمایا۔

اس تقریبِ سعید کے موقع پر، جو ہمارے عظیم ملّی، مردِ درویش، حکیم (الامت) اور مفکر کی حسین یاد منانے کے لئے منعقد کی جا رہی ہے، میں مرحوم کی بارگاہ میں قلبی خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

وہ اگرچہ آج ہم میں زندہ موجود نہیں لیکن ان کی شاعری، جو یقیناً لافانی ہے، ہماری راہ نمائی اور روح پروری کیلئے ہر وقت ہمارے پاس ہے۔ ان کی شاعری، جس کا اندازہ نہایت حسین اور زبان نہایت شیریں ہے، اس عظیم شاعر کے قلب و دماغ کی صحیح تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس سے ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے کس قدر سرشار اور اس کے کس حد تک وفا شعار تھے۔ وہ حضورِ نبی اکرمؐ کے ایک سچے اور پُرخلوص متبع تھے ـــــــ وہ اول بھی مسلمان تھے اور آخر بھی مسلمان ـ وہ ترجمان الاسلام، بلکہ صوت الاسلام تھے۔

علامہ اقبالؒ ایک نظری مبلغ اور مفکر ہی نہیں تھے۔ وہ جرأت اور عمل، استقامت اور خود اعتمادی کی محکم چٹان تھے۔ اور ان سے بھی بلند، خدا پر غیر متزلزل یقین اور اسلام کے ساتھ بے پناہ عقیدت کے پیکر۔ ان کی ذات میں ایک شاعر کے تخیلات اور ایک ایسے انسان کی حقیقت پژوہی کے خواص مجتمع تھے جو حالات کا عملی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیتا ہے۔ عملِ پیہم اور (خدا پر) یقینِ محکم، یہ ہے ان کے پیغام کا خلاصہ۔ اور اس سے وہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے (دنیا کے سامنے) نمودار ہوتے ہیں۔ اسلامی اصولوں کی محکمیت، پر انہیں غیر متزلزل یقین تھا۔ کامیابی سے ان کی مراد، تعمیرِ خودی تھی۔ اور ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ، اسلامی تعلیمات کا اتباع ـــــــ تعمیرِ خودی اور عملِ پیہم، نوعِ انسان کے نام ان کا پیغام تھا۔

وہ اگرچہ ایک عظیم شاعر تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک عملی سیاستدان بھی تھے۔ وہ اسلامی اصولوں پر ایمانِ کامل اور یقینِ محکم کی بنا پر، ان چند افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ خیال پیش کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو الگ کر کے ایک اسلامی مملکت متشکل کی جا سکتی ہے۔ یہ علاقے مسلمانوں کے تاریخی اماکن بھی ہیں۔

میں اقبال ڈے کی اس تقریب میں عمیق قلب سے شریک ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ ہم اپنے اس ملی شاعر کے پیش کردہ نظریات پر عمل پیرا ہوں تاکہ جب مملکتِ پاکستان متشکل ہو تو ہم ان نظریات کو عملی قالب میں ڈھال سکیں[۱]۔

علامہ اقبالؒ نے قائدِ اعظمؒ کو جو خطوط، مئی ۱۹۳۶ء اور نومبر ۱۹۳۷ء کے دوران لکھے تھے، ان کا مجموعہ شائع ہوا تو قائدِ اعظمؒ نے اس کا پیش لفظ خود تحریر فرمایا۔ چونکہ یہ پیش لفظ علاوہ اس حقیقت کے کہ اس میں علامہ اقبالؒ

---

[۱] یہ پیغام اپنی اصل شکل میں، مرکزیہ مجلسِ اقبال رح (لاہور) کی طرف سے شائع کردہ کتاب IQBAL (THE POET OF TOMORROW) میں موجود ہے۔

کی ان خدمات کو سراہا گیا ہے جو انہوں نے لیگ کے پیشِ نظر ملّی مقاصد کے سلسلہ میں سرانجام دیں، خود قائدِ اعظمؒ کے الفاظ میں۔ اس دور کے اہم واقعات کی بھی نشاندہی کرتا ہے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا پورا ترجمہ پیشِ خدمتِ قارئین کر دیا جائے۔[1]

"یہ خطوط جو اس کتاب میں شامل ہیں وہ ہمارے قومی شاعر، فلسفی و دانشور مرحوم ڈاکٹر سر اقبالؒ نے مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصہ میں مجھے تحریر کئے تھے۔ یہ بات ان کی وفات سے چند ماہ قبل کی ہے۔ یہ عرصہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے ایسے دور کے ساتھ آیا ہے جو نہایت اہم واقعات سے پُر ہے۔ یعنی کل ہند مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے قیام واقعہ جون ۱۹۳۶ء اور اکتوبر ۱۹۳۷ء کے تاریخی اجلاس لکھنؤ کا درمیانی وقفہ۔ مرکزی پارلیمانی بورڈ اور اس کی صوبائی شاخیں پہلی بڑی کوشش تھی کہ قانون حکومتِ ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے آئندہ انتخابات کے لئے مسلمانوں کی رائے عامہ ہموار کی جائے، جس کے تحت صوبائی اسمبلیوں کے لئے لیگ کے ٹکٹ جاری کئے گئے تھے۔ اگر یہ پہلا اہم قدم تھا تو دوسرا بڑا قدم جو اٹھایا گیا وہ اجلاسِ لکھنؤ میں یہ مرحلہ طے کرنا تھا کہ مسلم لیگ کو کس طرح ازسرِنو منظم کیا جائے تاکہ وہ مسلم ہند کی واحد با اختیار نمائندہ جماعت بن جائے۔ دیگر حضرات کے علاوہ سر محمد اقبالؒ نے اپنے جذبۂ قومی اور بے غرضانہ و مخلصانہ مساعی سے جو میری مدد کی اس نے ان اعلیٰ مقاصد کے حصول میں بڑا کام کیا اور لیگ اتنے قلیل عرصہ میں برابر قوت پکڑتی چلی گئی۔ ان تمام صوبوں میں آل انڈیا لیگ پارلیمانی بورڈ قائم کئے گئے اور لیگ پارٹیاں بنائی گئیں، لیگ کے امیدواروں نے مقابلے میں شرکت کی اور جس قدر نشستوں کے لئے انتخاب لڑے ان میں سے ساٹھ تا ستر فی صد تک نشستیں جیت لیں۔ پھر تقریباً تمام صوبوں میں مدراس سے لے کر صوبہ شمال مغربی سرحد تک سینکڑوں ابتدائی اور اضلاعی لیگیں قائم ہو گئیں۔ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور لیگ کو اپنے سامنے جھکانے کی نیت سے کانگریس نے عوامی رابطہ کی تحریک شروع کر دی تھی۔ اس کے باوجود لیگ نے بیشتر ضمنی انتخابات بھی جیت لئے اور جو لوگ ریشہ دوانیوں اور عیارانہ سازشوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی فکر کر رہے تھے کہ لیگ کے نظام کو مسلمانوں کی عام حمایت حاصل نہیں ـــــــ ان سب کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اجلاس لکھنؤ سے قبل اٹھارہ مہینے کے اندر اندر مسلم لیگ اس بات میں کامیاب ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کو ایک پارٹی کی طرح منظم کر دے اور اس کا ایک ترقی پسندانہ اور ترقی پذیر پروگرام بھی وجود میں آ گیا اور اس کے زیرِ اثر ایسے صوبے بھی آ گئے جو وقت کی کمی یا تیاری کی کمی کے باعث ابھی تک لیگ پارلیمانی بورڈوں کی سرگرمیوں سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھا سکے تھے۔ مسلمانوں کے تمام طبقوں اور گروہوں میں مسلم لیگ کو کتنی مقبولیت حاصل تھی اجلاسِ لکھنؤ نے اس کا ناقابلِ تردید ثبوت بھی مہیا کر دیا۔ مسلم لیگ کی یہ بھی بہت بڑی کامیابی تھی کہ اکثریتی اور اقلیتی دونوں ہی صوبوں میں اس کی رہنمائی کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ سر محمد اقبالؒ نے اس مجموعی کامیابی کے پیدا کرنے میں بڑا امتیازی کردار ادا کیا۔ گو وہ اس وقت عوام کے سامنے نہیں لایا گیا تھا۔ سکندر جناح سمجھوتہ پر عمل درآمد کے سلسلے میں ان کے اپنے کچھ شکوک تھے اور انہیں اس بات کی بڑی تشویش تھی کہ بغیر التوا کے اس کے نتائج کو کسی معقول شکل میں ابھرتا ہوا

---

[1] یہ ترجمہ آغا حسین ہمدانی کی کتاب "قائدِ اعظمؒ" میں شامل ترجمہ پر مبنی ہے۔

دیکھیں تاکہ اس کے بارے میں عوام کے شبہات و خدشات دور ہوں۔ مگر افسوس کہ وہ یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے کہ پنجاب میں ہمہ گیر ترقی ہوئی ہے اور اب یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ مسلمان مضبوطی کے ساتھ لیگ کے نظام کے ساتھ ہیں۔

اس مختصر تاریخی پس منظر کے بعد ان خطوط کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ مگر اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے اقبالؒ کو جو جوابات دیئے تھے وہ مہیا نہیں ہیں۔ زیرِ نظر زمانہ میں مَیں بالکل تن تنہا کام کرتا تھا اور مجھے ذاتی سٹاف کی مدد تک میسر نہ تھی اس لئے مجھے جس قدر خطوط کے جوابات دینے پڑتے تھے ان کی نقول بھی اپنے پاس نہ رکھ سکا۔ لاہور میں مَیں نے اقبالؒ ٹرسٹ کے لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میرے جوابات ادھر بھی دستیاب نہیں۔ لہٰذا میرے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ رہ گئی تھی کہ ان خطوط کو بغیر اپنے جوابات کے ہی شائع کر دوں کیونکہ ان کی تاریخی اہمیت بہت بڑی ہے۔ بالخصوص وہ خطوط جن میں انہوں نے بالکل واضح اور غیر مبہم طور پر مسلم ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے سلسلے میں اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیالات مجموعی طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور ہندوستان کو جو آئینی مسائل درپیش تھے ان کے گہرے مطالعے اور غور و خوض کے بعد آخراً میں بھی ان ہی نتائج تک پہنچا جو سر اقبالؒ کے تھے۔ یہی تصورات تھے جو اپنے وقت پر آکر مسلمانانِ ہند کے متفقہ ارادے کی شکل میں نمودار ہوئے اور لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی اس قرارداد کی صورت اختیار کر گئے جسے عام طور پر قراردادِ پاکستان کہا جاتا ہے اور جو ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو منظور کی گئی تھی۔"

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے دل میں ایک دوسرے کا کس قدر احترام اور عزت و توقیر تھی۔ ایک طرف انہیں دیکھئے اور دوسری طرف موجودہ دور کے "راہ نمایانِ ملّت" پر نگاہ ڈالئے جو ہر وقت ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور اُن پر کیچڑ اچھالنے کی فکر اور کاوش میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ ان دونوں (اوّل الذکر اور آخر الذکر) کے کردار میں اس قدر تفاوت کیوں ہے؟ اس لئے کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے پیشِ نظر کسی ذاتی مقصد یا مفادِ خویش کا حصول نہیں تھا۔ ان کے سامنے صرف ملّت کی فلاح اور منفعت تھی۔ اور چونکہ یہ ان دونوں کا مشترک مقصد تھا اس لئے وہ ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈال کر، جانبِ منزل رواں دواں تھے۔ آج ہر پارٹی اور ہر لیڈر کے سامنے اپنا اپنا گروہ بندانہ مقصد یا ذاتی مفاد ہے اس لئے ان میں باہمی رقابت اور عداوت کے جذبات کارفرما رہتے ہیں۔ سوچئے کہ اگر کہیں (خدانکردہ) اقبالؒ اور جناحؒ کی بھی یہی صورت ہوتی، اور وہ دونوں پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تو اس میں قوم جس بری طرح پستی، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ مشترکہ مقصد اور اس کے حصول کے لئے مخلصانہ تعاون، یہ ہیں وہ جوہر جن جن سے وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے قرآنِ کریم نے اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ ——— ائتلافِ قلبی ——— سے تعبیر کیا ہے۔ مملکتِ پاکستان، ان دونوں اربابِ بصیرت و عزیمت کے اسی ائتلافِ قلبی کا فطری نتیجہ ہے۔ سچ ہے اسہ

محبت چوں تمام افتد، رقابت از میاں خیزد
بطوفِ شعلہ، پروانہ با پروانہ می سازد